جلد ۱۹ عدد ۱۲

وقد اخذ میثاقکم ان کنتم مومنین (القرآن)

ماہنامہ

میثاق لاہور

دسمبر ۱۹۷۲ء

*

مدیر مسئول

ڈاکٹر اسرار احمد

ایم-بی-بی-ایس (پنجاب) ایم-اے، اسلامیات (کراچی)

اطلاع تبدیلی پتہ

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

کا دفتر (فون 68245)

۱۲ - افغانی روڈ - سمن آباد - لاہور

پر قائم ہو گیا ہے اور وہیں ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی رہائش بھی منتقل ہو گئی ہے۔

لہذا آئندہ، انجمن، ڈاکٹر صاحب اور دارالاشاعت الاسلامیہ کی جملہ خط و کتابت اسی پتہ پر کی جائے ..... (مینیجر)

یکے از مطبوعات

دار الاشاعۃ الاسلامیۃ لاہور

قیمت : سوا روپیہ

ماہنامہ میثاق لاہور

جلد ۱۹ | دسمبر ۱۹۷۲ء | عدد ۱۲

فہرست مضامین

✶ تذکرہ و تبصرہ

✶ ” وہی ذبح بھی کرے وہی لے ثواب الٹا “ ... اسرار احمد ۱

✶ ” کلا انھا تذکرہ “ ... مولانا امین احسن اصلاحی ۷

✶ تدبر قرآن

✶ تفسیر سورۂ یونس (۲)... ... مولانا امین احسن اصلاحی ۱۷

✶ مقالات

✶ کانٹ سے مارکس تک (۱)... ... پروفیسر یوسف سلیم چشتی ۳۳

✶ عربی تہذیب کے زیر اثر یورپ میں سائنسی نقطہ نظر کی ترویج و ترقی ... ... ڈاکٹر سٹین وڈقاپ ترجمہ: پروفیسر اعجاز احمد چودھری ۴۲

✶ طنز و مزاح

✶ مسٹر دھلوی اور ان کا 'عطر فتنہ' ... پروفیسر محمد منور ۴۹

✶ ” روٹیاں “ ... ... مسٹر دھلوی ۶۱

✶ تعارف کتب ۶۵

* میزان اقبال * بیس بڑے مسلمان * حیات محمد بزبان انگریزی
* مولانا حسین احمد مدنی : ایک شخصیت ـ ایک مطالعہ * مآثرالکرام
* صحیح مسلم کا انگریزی ترجمہ مع تعلیقات مفیدہ * تفہیم الاسلام یعنی حدیث پاک کے متعلق مغالطوں کا ازالہ ... ... از قلم پروفیسر یوسف سلیم چشتی

✶ اسباق النحو ... ... از قلم مولانا امین احسن اصلاحی ۷۱

✶ احساسات و تاثرات

✶ ایک خط ... ... رانا شمشیر خان ایم اے ۷۲

تذکرہ و تبصرہ

اسرار احمد

"وہی ذبح بھی کرے وہی لے ثواب الٹا"!

قارئین 'میثاق' گواہ ہیں کہ دسمبر ۷۰ء کے عام انتخابات میں[1] جماعت اسلامی پاکستان کے چاروں شانے چت ہو جانے کے بعد ہم نے ان صفحات میں کبھی جماعت یا مودودی صاحب کا ذکر تک نہیں کیا۔ ماسوائے اوائل ۷۲ء میں سقوط مشرقی پاکستان پر بحث کے دوران 'ایک مختصر سے تذکرے کے' جس کی حیثیت بالکل ضمنی تھی!

اس کا سبب یہ نہیں تھا کہ جماعت کی پالیسی سے ہمارا اختلاف ختم ہو گیا بلکہ صرف یہ تھا کہ ایسی عبرتناک شکست اور ذلت آمیز ناکامی کے بعد مزید تنقید "مرے کو مارے شاہ مدار" کے مترادف دکھائی دیتا تھا۔ چنانچہ اس کے باوجود کہ متعدد حضرات نے شدت کے ساتھ تقاضا کیا کہ جماعت اسلامی کی عبرتناک شکست پر مفصل تبصرہ کیا جائے، ہماری غیرت نے یہ بھی گوارا نہ کیا کہ چند سطور اسی طرح کی لکھ دیتے کہ "دیکھ لو! سیاسی معاملات میں ہماری سوجھ بوجھ صحیح ثابت ہوئی یا تمہاری لن ترانی؟" یا کم از کم یہ شعر ہی پیش خدمت کر دیتے کہ

اسی خاطر تو قتل عاشقاں سے منع کرتے تھے اکیلے پھر رہے ہو یوسف بے کارواں ہو کر

اس کے بالکل برعکس ہماری دلی کیفیت، خدا شاہد ہے کہ شفقت آمیز ہمدردی ہی کی رہی۔ یہاں تک کہ جب کہ مغرب میں مودودی صاحب کی اس تقریر کا ریکارڈ سننے میں آیا جو انہوں نے انتخابات میں ناکامی کے فوراً بعد غالباً دس جنوری کو "عذر گناہ" کے طور پر انتہائی معذرت خواہانہ انداز میں کی تھی تو واقعہ یہ ہے کہ دل میں شدید ہمدردی کا داعیہ ابھر آیا تھا اور یہاں تک خیال پیدا ہو گیا تھا کہ اب دوبارہ جماعت میں شامل ہو جانا چاہئے اور ہمیں اب اس راز کے افشا میں بھی کوئی باک نہیں کہ اگر کہیں واقعتہً مودودی صاحب کو یہ توفیق

---

[1] میثاق کے پرانے قارئین کو یاد ہو گا کہ راقم عام انتخابات سے ڈیڑھ ماہ قبل یعنی اوائل اکتوبر ۷۰ء ہی میں عازم حجاز ہو گیا تھا اور اس نے الیکشن کے نتائج وہیں سے سنے تھے!

حاصل ہو جاتی کہ وہ بقول علامہ اقبال مرحوم منطق کی ایچ پیچ والی دلیلوں میں مہارت دکھانے کے بجائے "اخلاص و مروت کی روش[1] اختیار کرتے ہوئے صاف صاف اقرار کر لیتے کہ ہماری بعد از قیام پاکستان کی پالیسی غلط ثابت ہو گئی ہے اور اب ہم دوبارہ اپنے سابقہ طریق کار ہی پر عمل پیرا ہو جائیں گے تو کم از کم راقم الحروف تو اپنے آپ کو جماعت کی رکنیت کے لیے دوبارہ پیش کر ہی دیتا[2] اس لیے کہ دوسرے جتنے بھی معاملات میں راقم کو اختلاف ہی نہیں شدید اختلاف ہے وہ سب مودودی صاحب کے ذاتی افکار و نظریات سے متعلق ہیں۔ جماعت کی پالیسی سے نہیں!

لیکن ع " ما درچہ خیالیم و فلک درچہ خیال!" ——— ادھر تو راقم ہی نہیں جماعت اسلامی سے علیحدہ ہونے والے دوسرے بہت سے لوگوں کے دلوں میں بھی یہ جذبات و احساسات پیدا ہو رہے تھے اُدھر قضائے خداوندی سے ہمارے دوست مصطفیٰ صادق صاحب نے جو خود بھی یکے از خارجین جماعت اسلامی ہی ہیں اپنے اخبار روزنامہ 'وفاق' میں مودودی صاحب کا ایک مفصل انٹرویو شائع کر دیا جس میں ایک بات، چاہے بر سبیل تذکرہ ہی سہی، بہرحال ایسی بھی آگئی جس نے سارے پرانے زخم ہرے کر دیئے اور گذشتہ تمام تلخیوں کو تازہ کر دیا!

اس سے قطع نظر کہ مذکرہ بالا پورے انٹرویو کا رنگ ہی یہ ہے کہ جیسے ایک نہایت ہی رفیع المرتبت اور عظیم الشان ہستی اپنی رفعت وعظمت کے بلند و بالا مینار کی آخری منزل سے دور نیچے کی طرف نگاہ غلط انداز ڈالتے ہوئے کلام کر رہی ہو۔ اور اس سے بھی قطع نظر کہ یہ انداز کسی خادم دین اور صحیح معنوں میں بندۂ رب کا ہو ہی نہیں سکتا بلکہ صرف ایک ایسے حد درجہ برخود غلط انسان ہی کا ہو سکتا ہے جس نے اپنی" انائے صغیر" پر بتکلف، وتصنع" انائے کبیر" کی" ردا"[3] اوڑھی ہوئی ہو ——— ہمیں بحث انٹرویو کے صرف اس حصے سے ہے جس میں' المیہ ماچھی گوٹھ' زیر بحث آیا ہے اور جہاں مودودی صاحب نے نہایت خود غلط انداز میں یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ جیسے اس مرحلے پر جماعت اسلامی سے علیحدہ ہونے والے لوگ نہایت ... ہیں اور گویا ... اور حد درجہ غدار اور ہٹ دھرم بھی اور گویا وہ اپنی اس بے جا ہٹ اور خواہ مخواہ کی ضد سے نہ صرف یہ کہ تحریک اسلامی کو کمزور کرنے کا سبب بنے بلکہ ذاتی طور پر خود مودودی صاحب کی دل شکنی و دل آزاری کے مرتکب بھی ہوئے تاہم اپنی تمام تر مظلومیت اور ستم رسیدگی کے علی الرغم

---

[1] معلوم ہے بیگانۂ اخلاص و مروت ۔ ہر چند کہ منطق کی دلیلوں سے ہے چالاک!

[2] چاہیے جماعت اسلامی کی ... اس پیشکش کو ٹھکرا ہی دیتی!

[3] حدیث قدسی کے الفاظ ہیں، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ "الکبریاء ردائی" تکبر میری چادر ہے۔ گویا یہ جامہ صرف اسی کو راست آتا ہے!

مودودی صاحب نے انتہائی شانِ بے نیازی و کرم گستری کے طفیل ان سب کو **معاف** فرما دیا ہے اور اپنے اس عفو و کرم کا اجر بھی وہ صرف خدائے قدوس ہی سے چاہتے ہیں ۔

اگرچہ ہم نے یہ بات تو بہت مرتبہ سنی ہے کہ "دنیا میں صرف وہی انسان کامیابی سے ہمکنار ہو سکتا ہے جو صرف ڈھیٹ ہی نہیں نہایت ڈھیٹ بن جائے"۔ اور یہ تلخ حقیقت بھی سننے میں آتی رہی ہے کہ اس دنیا میں کسی انسان کی کامیابی کا ایک خصوصی تعلق اس سے بھی ہے کہ وہ خود اپنے آپ کو دھوکہ دینے میں کس حد تک کامیاب ہو سکتا ہے ۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ تاحال ہمیں قطعاً اندازہ نہ تھا کہ انسان اپنے آپ کو اس درجہ فریب بھی دے سکتا ہے کہ — خود ظالم ہوتے ہوئے مظلوم بن جائے اور نہ صرف یہ کہ اپنے آپ کو پوری طرح باور کرا دے کہ واقعتہً وہی مظلوم ہوں بلکہ اپنے تصور ہی تصور میں ایک باقاعدہ عدالت بھی قائم کر لے اور اس میں اپنی مظلومیت اور فریق ثانی کے ظلم و ستم کو پوری طرح ثابت کر کے اسے پھانسی یا حبسِ دوام بعبور دریائے شور کی سزا بھی سنا دے اور پھر کمالِ رحم و کرم اور نہایت حلم و شرافت سے کام لیتے ہوئے اسے معافی کا پروانہ عطا فرما دے اور اپنی اس فراخ دلی عالی ظرفی اور کرم گستری پر آپ ہی عش عش بھی کر اٹھے اور خلق اور خدا دونوں سے داد طلب بھی ہو !

اسی "عالی ظرفی" اور "شرافت نفس" کی ایک اور مثال حال ہی میں سامنے آئی ہے ۔ یعنی یہ کہ بنگلہ بندھو شیخ مجیب الرحمٰن نے ازراہ الطاف خسروانہ پاکستان کو **معاف** کرنے کی فراخدلانہ پیشکش فرمائی ہے ۔ اس پر معاصر عزیز نوائے وقت نے کیا خوب لکھا ہے کہ :

> "چھوٹے بھائی نے آخر یہ بڑائی کا احساس کر ہی لیا۔ اور برادرانہ شفقت سے یہ کہہ دیا کہ "ہم پاکستان کو معاف کرنے کے لیے تیار ہیں" جب دونوں بھائیوں میں جھگڑا ہو تو آخر صلح و صفائی کی نوبت بھی آتی ہی ہے اور یہ اچھا ہوا کہ صلح صفائی کی آواز شیخ مجیب کی طرف سے اٹھی ۔ لیکن ہم اس معافی سے پہلے یہ ضرور پوچھنا چاہیں گے کہ قبلہ ! ہمارا وہ جرم تو بتا دیجئے جسے آپ معاف کرنے پر اتنی دیر کے بعد آمادہ ہوئے ہیں ! اس لیے کہ ہماری نظر میں تو معافی دینے کا حق ہمیں پہنچتا ہے کہ ہم آپ کو کس طرح معاف کر دیں ...... کیا یہ امر اس بات کے لیے کافی نہیں ہے کہ آپ ہمیں معاف کرنے کا اعلان کرنے کے بجائے ہم سے بجائے خود معافی کے طلبگار ہوں اور پھر ہماری عالی ظرفی دیکھیں ۔ لیکن یہ تو ایسا ہی ہوا جیسے برادران یوسفؑ کی طرف سے کسی مرحلے پر یہ اعلان ہوتا کہ انہوں نے اپنے بھائی یوسفؑ کو معاف کر دیا ہے گویا ؎
>
> وہی ذبح بھی کرے وہی لے ثواب الٹا !"

اس معاملے میں سردست ہمیں مودودی صاحب کی خدمت میں تو سوائے معاصر عزیز "نوائے وقت"

کے مندرجہ بالا الفاظ پیش کر دینے کے اور کچھ غرض نہیں کرنا ہے۔ اس لئے کہ ہماری رائے میں دسمبر ۷۰ء کے انتخابات کے نتائج سے ان کا جو نشہ ہرن ہو گیا تھا وہ اب چند نہایت چھوٹی چھوٹی سی باتوں مثلاً صدر مملکت کی جانب سے ملاقات کی خواہش یا تکمیلِ تفہیم کی ستہ نزائی تقریب کے باعث دوبارہ ان کے سر پر پوری طرح سوار ہو گیا ہے ـــــ البتہ جناب مدیرِ "وفاق" سے ہم یہ سوال ضرور کرنا چاہتے ہیں کہ "حضرت! اس بر خود غلط انداز پر آپ کی خاموشی چہ معنی دارد؟" ـــــ کیا آپ ہی نہیں ہیں کہ جنہوں نے ۱۹۶۶ء میں روزنامہ "وفاق" ہی میں راقم کی تالیف "تحریکِ جماعتِ اسلامی پر تبصرے" کے ضمن میں جائزہ کمیٹی کے "بزرگ ارکان" کی مظلومیت اور جماعتِ اسلامی کے داعی اور مؤسس کی "آمریت" کا نقشہ کھینچتے ہوئے لکھا تھا کہ:

"جاننے والے جانتے ہیں کہ مجلسِ شوریٰ کے ان بزرگ ارکان کی گرم آنسوؤں سے تر سفید داڑھیاں آج بھی مولانا مودودی کی اس تادیبی کارروائی پر نوحہ کناں ہیں جو مولانا مودودی کے آمرانہ مزاج کا بدترین مظہر ثابت ہوئی اور جس کے تحت مولانا مودودی نے اپنے ان مخلص، متقی اور معمر رفیقوں کو نام نہاد سازش کے الزام میں شوریٰ کی رکنیت سے علیحدگی کے نوٹس دے دیئے تھے۔ مولانا مودودی کو کہاں اندازہ ہو گا کہ آج بھی جبکہ اس المیہ کو دس سال بیت چکے ہیں کتنے ہی سینوں سے سرد آہ کے ساتھ یہ صدا بلند ہوتی رہتی ہے کہ کاش مولانا مودودی اپنے اہم ترین رفیقوں سے محض کسی شیطانی وسوسہ کی بنا پر اس درجہ بدگمان نہ ہو گئے ہوتے کہ ان کی رفاقت سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محروم ہو جاتے۔

یہ چار بزرگ کون ہیں۔ جماعتِ اسلامی کا ذکر ان بزرگوں کے نام کے بغیر بالکل ادھورا رہتا ہے ان میں مولانا عبد الغفار حسن ہیں جن کا کردار تدین و تقویٰ اور علم و فضل کی دولتِ بے بہا سے مزین ہے۔ مولانا عبد الجبار غازی ہیں جو بڑھاپے میں بھی جوانوں کی سی گرمجوشی اور انتھک محنت سے کام لے کر جماعت کے تعلیمی نظام کی بنیادیں استوار کرنے میں مصروف رہے۔ شیخ سلطان احمد ہیں جو اخلاص، جذبۂ انفاق اور تدبر و حکمت میں بے مثل کردار کے حامل ہیں۔ یہ تینوں حضرات وقتاً فوقتاً مولانا مودودی کے قائم مقام کی حیثیت سے کل پاکستان جماعتِ اسلامی کی امارت کے منصب پر فائز رہ چکے ہیں اور چوتھے مولانا عبد الرحیم اشرف ہیں جو دینی غیرت و حمیت، جوش و ولولہ اور عزم و ہمت میں اپنی مثال آپ ہیں۔

یہ ہیں وہ چار اصحاب جن پر "سازش" کا شبہ کیا گیا حالانکہ سچی بات یہ ہے کہ اس دور میں اسلام کے خلاف سب سے خطرناک سازش کا ارتکاب خود مولانا مودودی سے ہوا ہے۔ . .

. . . . . . ہے"

اب ہم تو نہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ آپ کی وہ تحریر خالص "قلم کاری" کا مظہر تھی اور نہ ہی یہ کہہ سکتے ہیں کہ اب آپ کا مودودی صاحب

کے ان الفاظ کو جوں کا توں بلا کسی اختلافی نوٹ تک کے شائع کر دینا محض 'اخبار فروشی' کا کرشمہ ہے۔ تاہم آپ خود غور فرمائیں کہ آپ نے خود ہی اپنے آپ کو ایسی پوزیشن میں لا کھڑا کیا ہے کہ آپ کیلئے ان دونوں میں سے ہی ایک الزام کو قبول کئے بغیر چارہ نہیں! — (اور اگر کوئی تیسری صورت بنتی ہو تو ضرور مطلع فرمائیں ہم یقیناً ممنون ہوں گے۔ مَتِّعُوْا تُوجَرُوا — !!)

۵۶-۵۵ء میں جماعت اسلامی پاکستان میں جو شدید اختلاف رائے پیدا ہوا تھا اس کی حقیقی نوعیت ہم نے اپنی تالیف "تحریک جماعت اسلامی: ایک تحقیقی مطالعہ" میں پوری وضاحت سے بیان کر دی تھی۔ —— اس کے بعد ۵۸-۵۷ء میں جو عظیم زلزلہ جماعت کی صفوں میں آیا اور جماعت کی اس وقت کی مجلس شوریٰ کا اہم ترین عنصر عام ارکان کی ایک اچھی خاصی تعداد کے ساتھ جماعت سے علیحدہ ہو گیا۔ یہ تمام واقعات کیوں اور کیسے رونما ہوئے؟ اس موضوع پر بھی ہم نے ۶۷-۶۶ء میں 'میثاق' کے صفحات میں 'نقضِ غزل'[1] کے عنوان سے لکھنا شروع کیا تھا۔ لیکن ابھی اس سلسلے کی صرف پانچ ہی اقساط شائع ہوئی تھیں کہ انہی "کشتگانِ خنجرِ تسلیم" میں سے دو بزرگوں یعنی مولانا عبد الغفار حسن اور شیخ سلطان احمد صاحب کے حکم سے اسے روک دینا پڑا تھا۔

اب محسوس ہوتا ہے کہ اس کی تکمیل لازمی ہے۔ تاکہ تاریخ کا ریکارڈ درست و راست (STRAIGHT) رہے اور یہ بات مبرہن ہو جائے کہ اس المیے کی اصل ذمہ داری کس پر ہے اور "وَالَّذِیْ تَوَلّٰی کِبْرَہٗ" کا حقیقی مصداق کون ہے۔ برصغیر پاک و ہند کی جماعت اسلامی بہرحال امتِ مسلمہ کی تاریخ کا ایک جزو بن چکی ہے اور اس کی ناکامی بلکہ تباہی کے اسباب کی کھوج کرید مستقبل کے مورخ کو لازماً کرنی ہو گی اور اگر اس قسم کے چلتے ہوئے فقروں (PASSING REMARKS) سے اغماض کر لیا گیا اور تصویر کا اصل رخ محفوظ نہ کیا گیا تو یقیناً ایک بہت بڑی ناانصافی ہو گی۔ ہماری رائے میں اب اس قرض کو چکا دینے کا وقت آ ہی گیا ہے۔ لہٰذا ان شاء اللہ العزیز جلد ہی جماعت اسلامی کی تاریخ کے اس سیاہ باب کو مکمل کر کے کتابی صورت میں[2] شائع کر دیا جائے گا۔!

---

[1] یہ عنوان ماخوذ ہے سورہ نحل کی اس آیت سے کہ: "وَلَا تَکُوْنُوْا کَالَّتِیْ نَقَضَتْ غَزْلَہَا مِنْۢ بَعْدِ قُوَّۃٍ اَنْکَاثًا" "اس عورت کے مانند نہ ہو جس نے محنت سے کاتے ہوئے سوت کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا۔"

[2] اس لئے کہ 'میثاق' کے صفحات اب ایک ایسے مثبت کام کیلئے وقف ہو چکے ہیں جس میں اس قیل و قال کی کوئی گنجائش نہیں ہے!

اتفاق کی بات ہے کہ ان ہی دنوں مولانا احتشام الحق تھانوی کا بھی ایک مفصل انٹرویو ہفت روزہ "چٹان" لاہور میں شائع ہوا ہے جس میں انہوں نے ۷۰ء کے انتخابات کے موقع پر "اسلام پسند" جماعتوں کے متحد نہ ہو سکنے کا اصل سبب مودودی صاحب اور ان کی ہیرو کریسی کو قرار دیا ہے اور یہاں تک کہہ دیا ہے کہ انہیں باوثوق ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ سابق صدر یحییٰ خان نے اپنے ایک وزیر باتدبیر کی وساطت سے مودودی صاحب اور ان کی جماعت کو یہ یقین دلا دیا تھا کہ آپ تنہا اپنے زور بازو سے ساری بازی جیت سکتے ہیں اور جب اقتدار پورے کا پورا بلا شرکت غیرے آپ ہی کو منتقل ہو سکتا ہے تو خواہ مخواہ اس میں دوسروں کو شریک کرنے سے فائدہ ؟

ہم اگرچہ اس پوزیشن میں تو نہیں ہیں کہ تھانوی صاحب کے اس الزام کی بالکلیہ تردید یا تائید کر سکیں تاہم یہ بات ہمیں یقینی طور پر معلوم ہے کہ ۷۰ء میں "المیہ مچھی گوٹھ" کی اصل وجہ مودودی صاحب کی کچھ اسی قسم کی حد سے بڑھی ہوئی خود اعتمادی بلکہ صحیح تر الفاظ میں طفلانہ خوش فہمی ہی تھی۔ اس وقت بھی وہ نہایت معصومانہ انداز میں یہ باور کئے بیٹھے تھے کہ میں پاکستان میں سیاسی اقتدار کی بازی تقریباً جیت چکا ہوں اور کوئی دن کی بات ہے کہ جماعت اسلامی حکومت کے سنگھاسن پر براجمان ہو جائے گی لیکن کچھ نادان دوست اور ناسمجھ ساتھی خواہ مخواہ کی مایوسی کے باعث راستہ روک کر کھڑے ہو گئے ہیں۔ اندریں حالات "تحریک اسلامی کے مفادات و مصالح کا تقاضا" ہے کہ اس کا "قائد اعلیٰ" اپنے "فرائض منصبی" کا لحاظ کرتے ہوئے ایسے سب لوگوں کو جماعت سے علیحدہ ہونے پر مجبور کر دے۔ چنانچہ "اپنے سینے پر پتھر رکھ کر یہ ناخوشگوار فریضہ انہوں نے ادا کر دیا"۔

اب بجائے اس کے کہ بعد میں جو حالات سامنے آئے ان سے انہیں اپنی غلطی کا احساس ہوتا اور وہ اپنی زیادتیوں پر پشیمان ہو کر ان گشتگان جور و ستم سے معافی کے خواستگار ہوتے الٹا ان کو معاف کرنے کا کریڈٹ لے رہے ہیں۔ غالباً اسی کا نام ہے "چوری اور سینہ زوری"!

جیسے کہ اعلان کیا جا چکا ہے، ذاتی طور پر راقم کی تحویل میں "میثاق" کا یہ آخری شمارہ ہے۔ آئندہ اشاعت سے "میثاق" "یکے از مطبوعات مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور" کی حیثیت سے شائع ہو گا۔ یہ بھی خیال ہے کہ آئندہ یہ سفید کاغذ پر آفسٹ میں طبع ہو اور اس کا سائز بھی بدل کر ۲۲×۲۹/۸ ہی کر دیا جائے تاکہ تفسیر تدبر قرآن کے اوراق اسی میں شامل ہوں اور جوں کے توں نکال کر جلد کرائے جا سکیں۔ بہرحال اس سلسلے میں آخری فیصلے ابھی ہونے ہیں اور عین ممکن ہے کہ انتظامات کی تبدیلی کے باعث جنوری ۱۹۷۳ء کا پرچہ شائع نہ ہو سکے!

کَلَّآ اِنَّہَا تَذْکِرَۃٌ

مولانا امین احسن اصلاحی

(یہ مولانا کی اس تقریر کا حصہ اول ہے جو مولانا نے قرآنی تربیت گاہ منعقدہ جامعہ خضریٰ سمن آباد لاہور از ۱۳ تا ۲۲ اگست ۱۹۷۲ء کے اقتتاحی اجلاس میں ارشاد فرمائی تھی اور جس کا آخری حصہ "میثاق" کے پچھلے شمارے میں شائع کیا جا چکا ہے! مدیر)

خطبہ مسنونہ کے بعد فرمایا۔

بھائیو! میں سب سے پہلے اس حقیقت کا اظہار کر دینا چاہتا ہوں کہ میں اس اجتماع میں برکت دینے کے لیے نہیں بلکہ برکت لینے کے لیے حاضر ہوا ہوں۔ میری حاضری کا ایک مقصد تو یہ ہے کہ میں اپنے مخدوم اور محترم و دوست مولانا عبدالغفار حسن صاحب کے درس سے کچھ برکت حاصل کروں۔ برکت حاصل کرنا، میں نے اس لیے عرض کیا ہے کہ میں اب استفادہ کے قابل تو رہا نہیں صرف برکت ہی حاصل کر سکتا ہوں۔ مولانا سے مجھے صرف محبت ہی نہیں ہے بلکہ بلا شائبۂ تکلف عرض کرتا ہوں کہ مجھے ان سے عقیدت بھی ہے۔ درآنحالیکہ عقیدت کے معاملے میں میں بہت فیاض آدمی نہیں ہوں لیکن یہ واقعہ ہے کہ مجھے ان سے محبت ہی نہیں بلکہ عقیدت بھی ہے اور میں آپ لوگوں کو بہت خوش قسمت سمجھتا ہوں کہ آپ کو ان کے درس سے اور ان کی صحبت سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کرنے کا موقع ملے گا۔

میری حاضری کا دوسرا مقصد یہ ہے کہ آپ کی صحبت اور آپ کی معیت کا تھوڑا بہت ثواب میں بھی حاصل کر لوں۔ اس زمانہ میں ایسے انسانوں کی تو کمی نہیں ہے جو ارسطو کی تعریف کے مطابق انسان ہیں اسلیے کہ بہرحال وہ "حیوان ناطق" ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ بس حیوان ناطق ہی ہیں، قرآن کی تعریف کے مطابق "انسان" نہیں ہیں اس لیے کہ وہ بصیرت اور بصارت دونوں سے محروم ہیں۔ فی زمانہ ایسے انسان بہت ہی تھوڑے ہیں جو اصل حقیقت کو سمجھنے کے لیے جدوجہد کریں، اس کے لیے گھر سے نکلیں، اس کے لیے تکلیفیں اٹھائیں، اس کے لیے ان کے اندر ذوق شوق ہو۔ میں آپ لوگوں کو انہی

میں شمار کرتا ہوں جو ایک نہایت ہی محبوب اور عظیم مقصد کے لیے گھر سے نکلے ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کے اس ارادے میں خیر و برکت عطا فرمائے اور آپ کو زیادہ سے زیادہ مستفید اور مستفیض ہونے کا موقع دے۔

حضرات! میرا ارادہ تو یہی تھا کہ میں شرکت کے ذریعے برکت حاصل کروں لیکن میرے عزیز بھائی شیخ سلطان احمد صاحب اور برادر عزیز ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی مجھے یہ خواہش بھی معلوم ہوئی کہ میں آپ کے سامنے تقریر بھی کروں، تو میں نے ان کی خواہش کی تعمیل ضروری سمجھی، لیکن میں جو کچھ عرض کروں گا اس کی نوعیت ہرگز تقریر کی نہیں ہوگی بلکہ چند نہایت ہی واضح اور بدیہی حقیقتوں کی تذکیر ہی کی ہوگی۔ یعنی صرف یاددہانی۔ حقیقت یہ ہے کہ بعض حقیقتیں اپنی جگہ انتہائی واضح ہوتی ہیں لیکن شاید اپنی شدتِ وضاحت ہی کی وجہ سے بہت مجہول ہو جاتی ہیں لہٰذا ان کی وقتاً فوقتاً تذکیر ہوتی رہنی چاہیے۔ میری اپنی زندگی کی رہنمائی میں ان حقائق نے بہت مدد دی ہے۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ اس موقع پر آپ کو بھی ان کی یاددہانی کرا دوں تاکہ آپ حضرات بھی ان سے فائدہ اٹھائیں۔

سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ خدا ہے اور ضرور ہے اور خدا کے ماننے پر ہر انسان مجبور ہے۔ جو لوگ خدا کا انکار کرتے ہیں وہ ایک بدیہی حقیقت کا انکار کرتے ہیں۔ میں اس معاملہ میں اپنا ذاتی احساس عرض کر دیتا ہوں کہ جب اول اول مجھے اس حقیقت کا شعور ہوا کہ خدا ہے اور ضرور ہے، نیز یہ کہ انسان اس کا انکار نہیں کر سکتا اور اس سے مفر نہیں ہے تو اس کے ساتھ ہی اس بات کا بھی ادراک ہوا کہ اس ماننے سے بہت بھاری ذمہ داریاں انسان پر عائد ہو جاتی ہیں۔ جب کبھی میں ان ذمہ داریوں کے متعلق سوچتا تو ایسا معلوم ہوتا کہ اس کا بوجھ میری کمر توڑ دے گا۔ جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ کچھ فلسفی ایسے بھی ہیں جو خدا کا انکار کرتے ہیں تو واقعہ یہ ہے کہ مجھے یہ خواہش پیدا ہوئی کہ ان کی چیزوں کا بھی مطالعہ کروں اور صاف طور پر عرض کیے دیتا ہوں کہ بغیر کسی تعصب کے میں نے ان چیزوں کا مطالعہ کرنا چاہا۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ میرے اندر یہ چھپی ہوئی خواہش بھی موجود تھی کہ اگر یہ فلسفی یہ ثابت کر دیں کہ خدا نہیں ہے تو میں اس کا خیر مقدم کروں گا اس لیے کہ اس طرح بہت بڑے بوجھ سے نجات مل جائے گی۔ یہ ایک مخفی راز ہے جو میں آپ پر ظاہر کر رہا ہوں۔ ویسے الحمدللہ مجھ پر الحاد کا کوئی دور نہیں گزرا ہے۔ لیکن مجھ پر ایک ایسا دور ضرور گزرا ہے کہ جب میرے اندر یہ خواہش تھی کہ اگر یہ فلسفی حضرات خدا کا انکار ثابت کر دیں اور مجھے مطمئن کر دیں کہ خدا نہیں ہے تو بہرحال ایک اطمینان کا سانس لینے کا موقع ملے گا اور ایک بھاری بوجھ اتر جائے گا۔ اس خواہش کے تحت میں نے متکلمین کی، دہریوں کی، منکرین کی، ڈاروِن کی، مارکس کی

فرائڈ کی، غرض کہ ان سب لوگوں کی کتابیں بڑی دلچسپی سے پڑھیں اور بغیر کسی تعصب کے پڑھیں، لیکن میں آپ سے سچ کہتا ہوں کہ یہ ساری چیزیں پڑھنے کے بعد مجھ پر یہ حقیقت واضح ہوئی کہ ——— یہ سب خرافات ہیں۔ ایک بدیہی حقیقت سے انکار کی خواہش ان سے یہ کام کرا رہی ہے، باقی رہ گیا یہ کہ خدا کے انکار کے لیے ان لوگوں کے پاس واقعی کوئی دلیل ہے تو اس کی سرے سے گنجائش ہی نہیں۔ جو بات یہ پیش کرتے ہیں، اس سے ہزار گنا مضبوط اور بدیہی بات وہ ہے جو قرآن پیش کرتا ہے کہ ایک خدا کو، ایک رب کو، ایک رحمان کو، ایک رحیم کو، ایک علیم کو، ایک خبیر کو، ایک سمیع کو اور ایک بصیر کو مانو۔ اس بات پر عقل بھی گواہی دیتی ہے اور فطرت بھی گواہی دیتی ہے۔ ظاہر بھی گواہی دیتا ہے اور باطن بھی گواہی دیتا ہے۔ آفاق بھی گواہی دیتے ہیں اور انفس بھی گواہی دیتے ہیں۔ غرض کہ ایک ایک چیز گواہی دیتی ہے۔ ہمارے متکلم اور ہمارے فلسفی لوگ خدا کے وجود پر اگر کوئی دلیل قائم کر نہیں پاتے تو جانتے ہو کہ اس کی وجہ کیا ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ دلیل وہاں کام دیتی ہے جہاں دلیل دعویٰ سے زیادہ واضح ہو لیکن اگر دعویٰ دلیل سے زیادہ واضح ہو تو وہاں دلیل بے کار ہے۔ وہاں دلیل کیا کام کرے گی؟ وہاں ارسطو کی منطق کیا کام کر سکتی ہے؟ وہاں متکلمین کا علم کلام کیا کام کر سکتا ہے؟ سورج کے وجود پر آپ کیا دلیل لا سکتے ہیں؟ چاند کے لیے آپ کیا دلیل لا سکتے ہیں؟ اسی طرح آسمان اور زمین کے وجود پر آپ کیا دلیل لا سکتے ہیں۔ ان چیزوں پر دلیل لانے کی کوشش کرنا درحقیقت حماقت ہے۔ یہ بدیہیات ہیں۔ فطرت کی، آفاق کی، انفس کی، عقل کی سب کی بدیہیات! اس مطالعہ سے مجھ پر یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ جو لوگ خدا کا انکار کرتے ہیں، وہ محض انکار کرنے کی خواہش کے زیر اثر اندھے اور بہرے ہو گئے ہیں اس لیے کہ وہ جس علت العلل کو، جس محرک اول کو، جس مادہ کو، جس خلیہ کو، اس عظیم کائنات کا سبب قرار دیتے ہیں، اس سے زیادہ اور اس سے لاکھ درجہ آسان اور عقل اور دل کے لیے قابل قبول بات وہ ہے جو قرآن کہتا ہے۔ میں اس کائنات کو کسی محرک اول کی حرکت کا نتیجہ مان لوں! اس حماقت میں مبتلا ہونے سے زیادہ بہتر یہی ہے کہ میں یہ مان لوں کہ بیشک خدا ہے اور ان ہی صفات کے ساتھ ہے جو قرآن کہتا ہے۔

تو غور کرنے سے معلوم ہوا کہ جو لوگ خدا کا انکار کرتے ہیں، وہ درحقیقت خدا کو ماننے کی جو عظیم ذمہ داریاں انسان کے اوپر عائد ہوتی ہیں ان سے فرار اختیار کرنا چاہتے ہیں۔ اس کے سوا کوئی اور وجہ نہیں ہے۔ اور اس میں واقعتہً کوئی شک نہیں ہے کہ خدا کو ماننے کے بعد جو عظیم ذمہ داریاں

انسان کے اوپر عائد ہوتی ہیں۔ وہ بڑی اہم ہیں۔ بڑی مشکل ہیں۔ بڑی کٹھن ہیں اور بڑی دشوار ہیں۔ اس راہ میں آگے بڑھنا، صرف اسی وقت ممکن ہو سکتا ہے جب کہ آدمی سر ہتھیلی پر رکھ کر آگے بڑھے۔ اس میں حضرت یحییٰؑ کی طرح سر کٹوانا پڑتا ہے۔ حضرت مسیحؑ کی طرح سولی پر چڑھنا پڑتا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کی طرح آگ میں کودنے کے لیے تیار ہونا پڑتا ہے اور ان تمام مراحل اور مقامات سے گزرنا پڑتا ہے جن مراحل اور مقامات سے ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے صحابہ کرامؓ گزرے۔ یہ کوئی آسان کام نہیں۔ ظاہر ہے کہ اس کے لیے ہر شخص ہمت نہیں رکھتا اور اسی لیے لوگ گریز اختیار کرنا چاہتے ہیں۔ .... لہٰذا وہ صاف صاف انکار کر دیتے ہیں کہ ہم ان جھگڑوں ہی میں نہیں پڑتے۔ وہ ان بدیہی حقیقتوں کو "موہوم" کہہ کر گویا ذمہ داریوں سے بچنے کا آسان راستہ نکال لیتے ہیں اور جو لوگ مانتے ہیں جیسے کہ ہم اور آپ۔ ہماری قوم۔ وہ درحقیقت اقرار مع انکار کی پالیسی اختیار کرتے ہیں۔ خدا کو مانتے ہیں لیکن خدا کو ماننے کے جو تقاضے ہیں، ان میں سے کسی تقاضا کو پورا کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ پھر اس کے بعد تقاضوں سے فرار کے لیے طرح طرح کے حیلے اور بہانے اختیار کر لیتے ہیں۔ بڑے فخر اور تعلّی کے ساتھ خدا کا اقرار بھی کرتے ہیں لیکن زندگی کے کسی مرحلہ میں خدا کے اقرار کے تقاضوں کو پورا کرنے اور خدا کے احکام بے چون وچرا عمل کرنے پر تیار نہیں ہوتے اور اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اگر دوسرے صریح اور کامل انکار میں مبتلا ہیں تو یقیناً ہم بھی اقرار مع الانکار میں مبتلا ہیں۔ اور ہماری پوری قوم مبتلا ہے۔

اصل چیز یہ ہے کہ خدا کو مانیے تو خدا کو ماننے کے جو مطالبے ہیں، جو تقاضے ہیں جو تضمنات ہیں، جو مضمرات ہیں، جو لوازمات ہیں، جو نتائج ہیں، ان کا مواجہہ کرنے کے لیے تیار رہیے حقیقت سے گریز کی پالیسی، نہایت بزدلانہ بلکہ منافقانہ ہے۔ اور قرآن کے مطالعہ سے میں جس نتیجہ پر پہنچا ہوں، وہ یہ ہے کہ مآل کے لحاظ سے کفر اور نفاق میں کوئی فرق نہیں ہے۔ ان کے مابین فرق صرف ظاہر کا فرق ہے۔ نتیجہ کے لحاظ سے کوئی فرق نہیں ہے۔ دونوں کا انجام ایک ہے۔ تو جو لوگ انکار میں مبتلا ہیں وہ تو انکار میں مبتلا ہیں ہی لیکن جو لوگ اقرار والے انکار میں مبتلا ہیں تو واقعہ یہ ہے کہ وہ صریح نفاق میں مبتلا ہیں۔ اب اس صریح نفاق کو اپنے اندر سے نکالنا ایک بڑا معرکہ ہے اور دوسروں کے اندر سے نکالنا اس سے بھی بڑا معرکہ ہے۔ اللہ جن کو ہدایت بخشتا ہے وہ نفاق کو اپنے اندر سے نکال سکتے ہیں اور جن کی ہدایت میں، جن کی توفیق میں زیادتی فرماتا ہے وہ دوسروں سے اس کو دور کرنے کی سعی و جہد کرتے ہیں لیکن اس کے لیے بڑی سخت بازی

کھیلنی پڑتی ہے۔ حاصل کلام یہ ہے کہ حقیقت سے گریز کی پالیسی بالکل غلط ہے۔ حقیقت کا مواجہہ کیجیے۔ اور پوری جرأت کے ساتھ مواجہہ کیجیے اور وہی بندے مبارک بندے ہیں جو یہ کام کریں۔ اللہ تعالیٰ کو بہت ساری بھیڑ مطلوب نہیں، وہ تو کمصن چاہتا ہے۔ اُسے تو وہ بندے پسند ہیں جو اس کو اس طرح مانیں جیسے کہ اس کو ماننے کا حق ہے۔ مولویوں کی زبان میں سننا چاہیں تو سنئے کہ "مانیں ماننا کر" سر دینے کے لیے تیار ہو کر مانیں۔ یوحنا و مسیح کی طرح مانیں، محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے صحابہؓ کے طریقہ سے مانیں۔ باقی اس کے سوا دوسرا طرزِ عمل مہمل اور خرافات ہے۔

پس حق کو جانیے۔ حق کو سمجھیے، حق کا علم حاصل کیجیے۔ حق کی معرفت حاصل کیجیے اور پھر اس حق کو اپنے اوپر قائم کرنے کے لیے اور دوسروں پر قائم کرنے کے لیے اپنے اندر صبر اور عزیمت پیدا کیجیے۔ اسی حق اور اسی صبر پر حقیقت میں صحیح زندگی قائم ہوتی ہے۔ جہاں تک حصول علم و معرفت کا تعلق ہے تو یہ زیادہ مشکل کام نہیں ہے۔ نبیوں کی تعلیم، نبیوں کے صحیفے، اللہ کا شکر ہے، موجود ہیں۔ اللہ کی آخری کتاب قرآن بتمام و کمال موجود ہے۔ آخری نبی کی سنت موجود ہے صحابہؓ کی زندگی موجود ہے۔ اگر آپ جاننا چاہیں اور آپ میں جاننے کا شوق اور طلب ہو جس طرح زندگی کی اور طلبیں ہیں، تو یہ کام بہت مشکل نہیں ہے۔ لیکن صبر کا معاملہ بہت مشکل ہے۔ یہ میری زندگی کا تجربہ ہے کہ صبر کا معاملہ واقعی بہت مشکل ہے۔ عزیمت کا معاملہ بہت مشکل ہے میں اس صبر کے متعلق عرض نہیں کر رہا ہوں جس کے کھوکھلے وعظ ہمارے منبروں سے ہوتے رہتے ہیں۔ بلکہ صبر حقیقی، عزیمت، استقامت سے میری مراد یہ ہے کہ اللہ کو ماننے اور حق کو تسلیم کرنے کے جو حقیقی تقاضے ہیں ان کو پورا کیا جائے۔ جس حق کو قبول کیا جائے اس کی اپنے قول و عمل سے شہادت بھی دی جائے۔ یہ ہر مومن کا فرض ہے۔ اولین فرض ہے۔

جس شخص میں حق کی طلب نہ ہو۔ حق کا علم حاصل کرنے کا شوق نہ ہو۔ اُسے آپ ارسطو کی تعریف کے مطابق انسان کہہ دیجیے لیکن میں تو اسے دو ٹانگوں پر چلنے والا جانور ہی سمجھتا ہوں[1]۔ میرے نزدیک وہ حقیقت میں انسان نہیں ہے جس میں حق کی طلب ہو، جس کا عظیم داعیہ انسان کی فطرت کے اندر موجود ہے۔ جس کے اندر یہ داعیہ نہیں ہے وہ مردہ ہے۔ وہ آدمی نہیں ہے بلید ہے اور جانور سے بھی زیادہ بلید ہے[2]۔ لہٰذا اس حق کو قائم کرنا بہت بڑی سعادت ہے۔ پہلے تو اس حق کو اپنے اوپر قائم کیجیے اس لیے کہ جس نے اپنے اوپر اس حق کو قائم نہیں کیا اس کا حق کی شہادت دینے کے لیے

---

[1] اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ [2] بَلْ هُمْ اَضَلُّ

اٹھ کھڑے ہونا فضول کام ہے۔ ایسے کھوکھلے سینوں کی شہادت کچھ کارگر نہیں ہوتی بالکل بے کار ہوتی ہے۔ صرف ان ہی لوگوں کو حق کی شہادت پیش کرنے کا حق ہے جو حق کو پہلے اپنے اوپر قائم کرلیں۔ اور اچھی طرح جان لیجیے کہ حق کی شہادت دینا بھی فرض ہے۔ حق کو جاننے والے اور علم صحیح رکھنے والے کے لیے دین میں، اور قرآن کے تیس پاروں میں کہیں کوئی گنجائش نہیں پاتا کہ اسے حق کی شہادت دینے سے مفر ہو۔ شہادتِ حق اس پر واجب ہے۔ لازم ہے، فرض ہے۔ دائیں بائیں، آگے پیچھے، جس حد تک ممکن ہو حق کی شہادت دیجیے۔

لیکن جب شہادت کا مرحلہ آتا ہے تو بڑی مشکلیں پیش آتی ہیں۔ اس کے لیے بسا اوقات ایسے ایسے لوگوں کے کانوں میں حق کی آواز دینی پڑتی ہے۔ جن کے کانوں میں یہ اذان دینا کوئی آسان کام نہیں ہوتا۔ بڑے عزیز تعلقات اس کے لیے منقطع ہوتے ہیں۔ بڑے بڑے عزیز رشتے اس کے لیے کٹ جاتے ہیں۔ بڑے بڑے محبوبوں کی دوستی اس کے لیے قربان کرنی پڑتی ہے اور بسا اوقات سب کچھ قربان کرنا پڑتا ہے۔ آخری چیز جان ہے۔ اس کی بھی نذر گزارنی پڑتی ہے اور صاف سن لیجیے کہ اگر آپ جان کو عزیز رکھتے ہوں تو اس راستہ میں بالکل قدم نہ رکھیے۔ یہ وہ راستہ نہیں جس میں آسانیاں ہوں۔ اس راستہ میں بڑی مشکلات ہیں۔ میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ میں ان تمام مشکلات کو بیان کروں۔ آپ قرآن کریم کا جو درس حاصل کریں گے ان سے یہ مشکلات معلوم ہو جائیں گی۔

لیکن میرے عزیز دوستو! ایک بات میں آپ کو ضرور بتانا چاہتا ہوں، اور کاش میں اسے اچھی طرح آپ کو سمجھا بھی سکوں۔ وہ بات یہ ہے کہ صبر کہنے کے لیے بہت آسان ہے، لیکن کرنے کے لیے بہت مشکل ہے۔ اور پھر یہی وہ چیز ہے جس پر صحیح زندگی استوار ہوتی ہے۔ جہاں تک اہل حق کا تعلق ہے۔ شہادتِ حق دینے والے لوگوں کا تعلق ہے۔ ان کو یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ صبر کی بنیاد ایک علمی حقیقت پر ہے۔ ایک حکمت پر ہے۔ جب تک وہ حقیقت و حکمت پوری طرح سے واضح نہ ہو، اس پر علم الیقین اور حق الیقین نہ ہو تو اس وقت تک صبر کرنا آسان نہیں ہوتا۔ وہ حقیقت و حکمت یہ ہے کہ آپ کے راستہ میں جو کچھ پیش آئے گا وہ اللہ کے ارادہ اور مشیت کے تحت پیش آئے گا۔ اللہ کے ارادہ اور مشیت کے سوا اس دنیا میں اور کوئی ارادہ اور مشیت کارفرما نہیں ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی یاد رکھیے کہ اللہ تعالیٰ کے ہر ارادہ میں خیر مضمر ہوتا ہے۔ اگرچہ ہمیں اس کا خیر معلوم نہ ہو۔ اسی حقیقت کو سمجھنے کے لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو

حضرت خضر کی تلاش میں نکلنے کا حکم ہوا۔ اس کو خوب اچھی طرح سمجھ لیجیے کہ جب تک آپ اس حقیقت کو مستحضر نہیں رکھیں گے آپ کی اندرونی زندگی میں اور آپ کی خارجی زندگی میں ایسے ایسے فتنے پیش آئیں گے کہ شیطان آپ کو لوٹا دے گا، آپ کے قدم متزلزل ہو جائیں گے۔ لیکن اگر اس حقیقت پر آپ کا مضبوط یقین ہے کہ جو ہوگا خدا کے ارادہ سے ہوگا اور خدا کا ارادہ ہمیشہ خیر اور حکمت ہی پر مبنی ہوتا ہے تو آپ یقین کریں کہ آپ بڑے سے بڑے مشکل مرحلہ میں بھی ثابت قدم رہیں گے۔ رہی یہ بات کہ خدا کا ہر ارادہ خیر پر مبنی ہے اور خدا کے ارادہ کے سوا کوئی دوسرا ارادہ اس کائنات میں کارفرما نہیں ہے تو یہ ہمارے ایمان کا تقاضا ہے۔ جو اس کو نہیں مانتا وہ مومن نہیں۔ اس کو سمجھنے کی دو شکلیں ہیں یا یہ کہ ہر کام کی حکمت ہمارے اوپر عیاں اور واضح ہو جائے۔ جس کا کوئی امکان نہیں اس لیے کہ ہم خدا تو نہیں بن سکتے۔ ہم بندے ہیں۔ ہمارا علم محدود ہے۔ یا پھر یہ کہ ہم اس بات پر یقین رکھیں کہ جو کچھ بھی ہوتا ہے، اس میں خدا کی حکمت مضمر ہوتی ہے۔ کچھ کی حکمت ہماری سمجھ میں آجاتی ہے اور کچھ کی حکمت اپنے محدود علم کی وجہ سے ہم سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں۔ لیکن یہ بات کہ ہر کام میں خیر و حکمت پوشیدہ ہوتی ہے تو اس پر پورا پورا ایمان اور یقین رکھیں خدا چاہے گا تو وہ آپ پر حکمت بھی واضح کر دے گا، لیکن حکمت جاننے کے لیے ہم کو بے صبر نہیں ہونا چاہیے، ہو سکتا ہے کہ اس راستہ میں آپ دیکھیں کہ ظالموں کی گرتی ہوئی دیوار، باغیوں اور طاغیوں کے گرتے ہوئے وقار کو سنبھالا دیا جاتا ہے۔ ظاہر کہ اس میں بھی خدا کی حکمت ہی کارفرما ہوگی۔ ہو سکتا ہے کہ اس راستہ میں آپ دیکھیں کہ اہل حق مظلوم ہیں، مقہور ہیں، ان کو ستایا جا رہا ہے، ان کو دکھ دیا جا رہے ہیں، وہ فاقے کر رہے ہیں۔ یہ باتیں بھی آپ دیکھیں اور اس پر یہی یقین رکھیں کہ اس میں بھی خدا کی کوئی حکمت ہوگی۔ یہاں مسکینوں کی کشتی میں سوراخ کرا دیا جاتا ہے تو اس کے اندر بھی حکمت مضمر ہوتی ہے۔ ظالموں اور باغیوں کی دیوار اونچی کرا دی جاتی ہے تو بہر حال اس دیوار کے نیچے، غریبوں اور یتیموں کا خزانہ پوشیدہ ہوتا ہے۔ ظالموں اور طاغیوں کو جو مہلت دی جاتی ہے، اس کے اندر کیا کیا حکمتیں ہیں تو ان میں سے کچھ کا اندازہ آپ کو قرآن مجید کے مطالعہ سے ہوگا اور اصل حقیقت تو قیامت کے دن ہمارے سامنے آئے گی۔

بہر حال ہمارا فرض یہ ہے کہ ہم اس بات پر ایمان رکھیں کہ اگر حق کی راہ میں کسی پر ظلم ہوتا ہے تو اسی کے اندر حکمت ہے۔ اسی کے اندر بہتری ہے۔ اسی کے اندر خیر ہے، اسی کے اندر فلاح ہے اور اسی کے اندر کامیابی ہے۔ اور اگر ظالموں کو، طاغیوں کو، سرکشوں کو، نافرمانوں کو،

باغیوں کو، غافلوں کو اور بے پرواؤں کو خدا کی طرف سے ڈھیل دی جاتی ہے تو اس کے اندر بھی حکمت ہے، اس پر بھی پورا یقین رکھیے۔ اگر آپ اس بنیادی حقیقت کو پیش نظر رکھیں گے تو یہ چیز ہمیشہ شیطان کے مقابلہ میں آپ کو پناہ میں رکھے گی۔ آپ ثابت قدم رہ سکیں گے۔ اور اگر اس سے غفلت ہو گئی تو شیطان آپ کو ٹھوکر کھلائے گا اور آپ کو دھوکہ دے گا۔ لہٰذا یہ بڑی بنیادی چیز ہے جو آپ کو ہمیشہ یاد رکھنی چاہیے۔

دوسری ایک اور بات بھی میں آپ کے سامنے واضح کر دینا چاہتا ہوں۔ وہ یہ کہ ہم کو اور آپ کو اس دنیا میں اپنا موقف اور مقام بھی طے کر لینا چاہیے کہ ہم اس دنیا میں "کیا" ہیں؟ خالق ہیں؟ ظاہر ہے کہ خالق نہیں ہیں، مخلوق ہیں۔ مالک ہیں؟ ظاہر ہے کہ مالک نہیں ہیں۔ مملوک ہیں۔ ہمارا صحیح موقف اور صحیح مقام جو قرآن مجید میں سورۂ حدید میں بیان ہوا ہے وہ یہ ہے کہ ہم مُسْتَخْلَفٌ ہیں۔ مُسْتَخْلِفٌ نہیں ہیں مُسْتَخْلَفٌ کا مفہوم اگر آپ اردو میں سمجھنا چاہیں تو یوں سمجھ لیجیے کہ ہم امین ہیں۔ ہمیں جتنی قوتیں، صلاحیتیں، اور ذہنی و دماغی قابلیتیں اور جسمانی توانائیاں ملی ہیں، جو مال، دولت، اسباب، سامان، ذرائع اور وسائل ملے ہیں ہم ان سب کے امین ہیں، مالک نہیں۔ اور جب ہم امین ہیں تو ظاہر بات ہے کہ ہمیں ہر امانت کے لیے جواب دہی کرنی ہے۔ ایک ایک چیز کے متعلق حساب دینا ہے۔ امانت دینے والے نے جس حد تک اختیار دیا ہے بے شک اس اختیار کے دائرہ کے اندر ہم اختیار استعمال کرنے کا حق رکھتے ہیں، لیکن اس کے باہر رتی برابر بھی ہٹے تو اس کا حساب دینا ہوگا، جواب دہی کرنی ہوگی اور نتیجہ بھگتنا ہوگا اور کسی ایسے ویسے سے نہیں بلکہ اس ہستی سے بھگتنا ہوگا جو ذرہ ذرہ کا علم رکھتی ہے۔ پھر یا تو اس بات کا انکار کر دیجیے کہ آپ مستخلف نہیں ہیں بلکہ مالک ہیں، ورنہ اپنے سمع پر، اپنے فواد پر، اپنے بصر پر، اپنی ایک ایک چیز پر پہرہ بٹھائیے، اپنی زبان پر بھی پہرہ بٹھائیے۔ یہ آپ کی زبان کس کی ترجمان ہے؟ یہ آپ کی عقل کی ترجمان ہے۔ یا آپ کے بطن اور فرج کی ترجمان ہے! ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی یہ نعمت عقل کی ترجمان ہے۔ ہم نے اس کو بطن اور فرج کا غلام بنا کر رکھ دیا ہے۔ اگر موقع ہوتا تو میں تفصیل سے آپ کو بتاتا کہ ہماری شاعری، ہمارا ادب اور ہمارا لٹریچر بالکل .... مہمل گندی، ناپاک اور لغو چیز بن کر رہ گئی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک شمشیر جوہر دار جو اللہ تعالیٰ نے ہمیں عطا فرمائی تھی، اس تلوار سے ہم نے گھاس کاٹنے کی درانتی کا کام لینا شروع کر دیا ہے۔

بہرحال اس بات کو ملحوظ رکھیے کہ ایک ایک چیز کے آپ مسئول ہیں۔ ذمہ دار ہیں ہر شخص اس

نقطۂ نظر کو سامنے رکھ کر زندگی بسر کرتا ہے، اس کے قدم جادۂ حق پر استوار رہتے ہیں اور جہاں اس حقیقت سے غفلت ہوئی وہیں، وہ فوراً مار کھا جاتا ہے۔ تو اس حقیقت کو ہمیشہ پیش نظر رکھیے اس موقف کو، اپنے مقام کو، اپنے درجہ کو، اپنے مرتبہ کو کبھی بھی فراموش نہ کیجیے اور اگر اس کے انکار کی آپ میں ہمت ہے تو میں کسی ایسے دوست کا خیر مقدم کروں گا جو مجھ پر ثابت کر دے کہ اس کے انکار کی عقلی دلیل موجود ہے اور اس کی گنجائش ہے۔ کم از کم قرآن مجید میں، جس پر آپ کا ایمان ہے، اس کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اگر یہ قرآن قبروں کے اوپر پڑھ کر صرف ایصالِ ثواب کے لیے ہے، تب تو میں کچھ نہیں کہتا۔ ان لوگوں کی قبروں پر بھی پڑھ کر اس کے ذریعہ ایصالِ ثواب کیجیے جنھوں نے ساری عمر کبھی قرآن کو ہاتھ تک نہ لگایا ہو۔ لیکن اگر قرآن زندگی کی ہدایت اور رہنمائی کے لیے ہے جیسا کہ فی الواقع وہ ہے، حق بتانے کے لیے ہے، صراطِ مستقیم پر گامزن رکھنے کے لیے ہے۔ مآل کار کا شعور دینے کے لیے ہے۔ تب میں یہ کہتا ہوں کہ آپ کا مستقر، آپ کا مقام اور آپ کا موقف اس قرآن میں یہی بیان کیا گیا ہے جو میں نے عرض کیا ہے۔ اگر کوئی صاحب اس کے برعکس مجھے کوئی بات سمجھا سکیں تو میں ان کا خیر مقدم کروں گا۔ یہ بات بڑی تفصیل سے بیان کرنے کی ضرورت تھی لیکن میں نے مختصراً عرض کیا ہے، چونکہ مجھ میں زیادہ بولنے کی طاقت نہیں ہے۔

(تقریر کا بقیہ حصہ گذشتہ شمارے میں شائع ہو چکا ہے)

أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ أَمْ عَلَىٰ قُلُوبٍ أَقْفَالُهَا

مبادی تدبرِ قرآن

از: مولانا امین احسن اصلاحی

عمدہ سفید کاغذ پر آفسٹ کی طباعت میں

بڑا سائز یعنی ۸/۲۲×۱۸ کے دو سو صفحات پر مشتمل، مضبوط جلد اور دبیز آفسٹ پیپر کے خوشنما ڈسٹ کور کے ساتھ

قیمت -/۶ روپے (محصول ڈاک علاوہ)

دار الاشاعت الاسلامیہ، کوثر روڈ، اسلام پورہ۔ لاہور

علومِ قرآنی کا بیش بہا خزانہ

مولانا امین احسن اصلاحی کی

تفسیر

تدبرِ قرآن

جلد اوّل

مشتمل بر مقدمہ و تفاسیر: آیت بسم اللہ، سورہ فاتحہ، سورہ بقرہ و سورہ آل عمران
سائز ۲۲ × ۲۹، صفحات ۸۸۰، عمدہ دبیز سفید کاغذ، آفسٹ کی دیدہ زیب طباعت۔
چرمی پشتہ کی مضبوط و پائدار جلد کے ساتھ۔ ہدیہ -/۳۶ روپے

جلد دوم

مشتمل بر تفاسیر: سورہ نساء، سورہ مائدہ، سورہ انعام و سورہ اعراف
سائز، کاغذ، طباعت اور جلد حسب سابق۔ صفحات ۸۰۸۔ ہدیہ -/۳۲ روپے

جلد سوم

مشتمل بر تفاسیر: سورہ یونس تا سورہ بنی اسرائیل۔ سائز، کاغذ، طباعت اور جلد
حسب سابق: صفحات ۸۰۸، (زیر طبع) محصولڈاک فی جلد -/۳ روپے

(شائع کردہ:)

دار الاشاعت الاسلامیہ کوثر روڈ۔ اسلام پورہ، لاہور

فون: ۶۹۵۲۲

تدبّرِ قرآن

مولانا امین احسن اصلاحی

تفسیر سورۂ یونس

(۲)

۲- آگے کا مضمون- آیات ۱۱-۱۹

آگے پہلے منکرین و مکذبین کے اس مطالبہ کا جواب دیا ہے جو وہ عذاب کے لیے کر رہے تھے کہ اگر جزا اور سزا ایسی ہی اٹل چیز ہے اور ہم اپنے اعمال کے باعث اس کے مستحق ہو ہی چکے ہیں تو اس عذاب کا کوئی نمونہ دکھا کیوں نہیں دیتے جس کی دھمکی سنا رہے ہو۔ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے اپنی اس سنت کا حوالہ دیا کہ خدا رحمت میں سبقت کرتا ہے، قہر کرنے میں وہ بڑا دھیما ہے۔ اگر قہر کرنے میں بھی وہ ویسا ہی جلدی کرنے والا ہوتا جیسا کہ فضل و رحمت کے معاملے میں ہے تو کب کا فیصلہ ہو چکا ہوتا۔ پھر انسان کی اس جلد بازی کی حقیقت واضح کی ہے کہ وہ مطالبہ تو عذاب کا بڑی ڈھٹائی کے ساتھ کرتا ہے لیکن جب ذرا خدا کی پکڑ میں آجاتا ہے تو واویلا شروع کر دیتا ہے! پھر جو نہی ذرا ڈھیل ملتی ہے اسی طرح اکڑنے لگتا ہے۔ ایسے لوگ ہدایت کسی صورت میں بھی قبول نہیں کرتے۔ پھر ان کو تاریخ کی طرف توجہ دلائی ہے کہ پچھلی قوموں کی سرگزشت میں، جن کے تم جانشین ہوئے ہو، کافی سامانِ عبرت موجود ہے، آخر ان کے حالات سے کیوں سبق نہیں لیتے، یہ کیوں ضروری سمجھتے ہو کہ وہی انجام تمہارا بھی ہو جو ان قوموں کا ہوا۔

اس کے بعد ان کے اس مطالبہ کا جواب دیا ہے جو وہ قرآن کو یکسر بدل دینے یا کم از کم اس میں ایسی ترمیم کے لیے کر رہے تھے جس کے بعد وہ ان کے لئے گوارا ہو سکے۔ وہ توحید کی تعلیم، اور جزا و سزا اور قہر و عذاب کی دھمکی سننے کے لیے تیار نہیں تھے اس وجہ سے کہتے تھے کہ اگر ہم سے منوانا ہے تو اس کتاب کی جگہ دوسری کتاب لاؤ یا اس میں تبدیلی کرو، بغیر اس کے ہم اس کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ ان کے جواب میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم

کی زبان سے کہلوایا کہ یہ میری بات نہیں ہے کہ میں اس میں کوئی ترمیم کر دوں۔ یہ تو خدا کی طرف سے ڈالی ہوئی ایک ذمہ داری ہے جو مجھے اٹھانی پڑی ہے۔ اگر اس کا کوئی امکان ہوتا کہ میں اس ذمہ داری سے جو مجھے اٹھانی پڑی ہے بچ سکوں تو میں کسی کو اس کی کانوں کان خبر نہ ہونے دیتا۔ میں نے تمہارے اندر ایک طویل زندگی گزاری ہے اور تم جانتے ہو کہ میں سیادت و امارت کا طالب کبھی نہیں رہا تو اس عمر میں آ کر آخر خدا پر ایک افترا کی ذمہ داری میں کس طرح لے سکتا ہوں۔

آخر میں عقیدۂ شرک کی لغویت واضح کی ہے اور مقصد یہ ہے کہ جس چیز کی حمیت و حمایت میں قرآن سے یہ بیزاری ہے وہ محض ایک خیال باطل ہے جس کا وجود نہ کہیں آسمان میں ہے نہ زمین میں ۔ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

وَلَوْ يُعَجِّلُ اللّٰهُ لِلنَّاسِ الشَّرَّ اسْتِعْجَالَهُمْ بِالْخَيْرِ لَقُضِيَ إِلَيْهِمْ
أَجَلُهُمْ ۚ فَنَذَرُ الَّذِينَ لَا يَرْجُونَ لِقَاءَنَا فِي طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُونَ ﴿١١﴾
وَإِذَا مَسَّ الْإِنْسَانَ الضُّرُّ دَعَانَا لِجَنْبِهِ أَوْ قَاعِدًا أَوْ قَائِمًا فَلَمَّا
كَشَفْنَا عَنْهُ ضُرَّهُ مَرَّ كَأَنْ لَمْ يَدْعُنَا إِلَىٰ ضُرٍّ مَسَّهُ ۚ كَذَٰلِكَ
زُيِّنَ لِلْمُسْرِفِينَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿١٢﴾ وَلَقَدْ أَهْلَكْنَا الْقُرُونَ مِنْ
قَبْلِكُمْ لَمَّا ظَلَمُوا وَجَاءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنَاتِ وَمَا كَانُوا لِيُؤْمِنُوا
كَذَٰلِكَ نَجْزِي الْقَوْمَ الْمُجْرِمِينَ ﴿١٣﴾ ثُمَّ جَعَلْنَاكُمْ خَلَائِفَ فِي الْأَرْضِ
مِنْ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُونَ ﴿١٤﴾ وَإِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ آيَاتُنَا بَيِّنَاتٍ
قَالَ الَّذِينَ لَا يَرْجُونَ لِقَاءَنَا ائْتِ بِقُرْآنٍ غَيْرِ هَٰذَا أَوْ بَدِّلْهُ ۚ
قُلْ مَا يَكُونُ لِي أَنْ أُبَدِّلَهُ مِنْ تِلْقَاءِ نَفْسِي ۖ إِنْ أَتَّبِعُ إِلَّا مَا يُوحَىٰ
إِلَيَّ ۖ إِنِّي أَخَافُ إِنْ عَصَيْتُ رَبِّي عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيمٍ ﴿١٥﴾ قُلْ لَوْ شَاءَ
اللّٰهُ مَا تَلَوْتُهُ عَلَيْكُمْ وَلَا أَدْرَاكُمْ بِهِ ۖ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا
مِنْ قَبْلِهِ ۚ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ﴿١٦﴾ فَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرَىٰ عَلَى اللّٰهِ
كَذِبًا أَوْ كَذَّبَ بِآيَاتِهِ ۚ إِنَّهُ لَا يُفْلِحُ الْمُجْرِمُونَ ﴿١٧﴾ وَيَعْبُدُونَ
مِنْ دُونِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ وَيَقُولُونَ هَٰؤُلَاءِ شُفَعَاؤُنَا
عِنْدَ اللّٰهِ ۚ قُلْ أَتُنَبِّئُونَ اللّٰهَ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي السَّمَاوَاتِ وَلَا فِي الْأَرْضِ
سُبْحَانَهُ وَتَعَالَىٰ عَمَّا يُشْرِكُونَ ﴿١٨﴾ وَمَا كَانَ النَّاسُ إِلَّا أُمَّةً وَاحِدَةً

آیات ۱۱ - ۱۹

فَاخْتَلَفُوْا ؕ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ فِيْمَا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ۝۱۹

اگر اللہ لوگوں کے لئے عذاب کے معاملے میں ویسی ہی سبقت کرنے والا ہوتا جس طرح وہ ان کے ساتھ رحمت میں سبقت کرتا ہے تو ان کی مدت تمام کر دی گئی ہوتی۔ تو ہم ان لوگوں کو جو ہماری ملاقات کے متوقع نہیں ہیں ان کی سرکشی میں بھٹکتے رہنے کے لیے ڈھیل دے دیتے ہیں۔ اور انسان کا حال یہ ہے کہ جب اس کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تب تو لیٹے، بیٹھے یا کھڑے ہم کو پکارتا ہے، پھر جب ہم اس کی تکلیف دور کر دیتے ہیں تو اس طرح چل دیتا ہے گویا کسی تکلیف کے لیے، جو اس کو پہنچی، اس نے ہم کو پکارا ہی نہیں تھا۔ اسی طرح حدود سے تجاوز کرنے والوں کی نگاہوں میں ان کے اعمال کھبا دیئے گئے ہیں۔ ۱۱ - ۱۲

اور ہم نے تم سے پہلے قوموں کو ہلاک کیا جب، کہ وہ ظلم کی مرتکب ہوئیں۔ اور ان کے رسول ان کے پاس کھلی کھلی نشانیاں لے کر آئے اور وہ ایمان لانے والے نہ بنے۔ ہم ایسا ہی بدلہ دیتے ہیں مجرم قوم کو۔ پھر ہم نے ان کے بعد تم کو ملک میں ان کا جانشین بنایا کہ دیکھیں تم کیسا عمل کرتے ہو۔ ۱۳ - ۱۴

اور جب ہماری کھلی ہوئی آیتیں ان کو پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو وہ لوگ، جو ہماری ملاقات کے متوقع نہیں ہیں، کہتے ہیں اس قرآن کے سوا کوئی اور قرآن لاؤ یا اس میں ترمیم کرو۔ کہہ دو مجھے کیا حق ہے کہ میں اس میں اپنے جی سے ترمیم کر دوں۔ میں تو صرف اس وحی کی پیروی کرتا ہوں جو مجھ پر آتی ہے۔ اگر میں نے اپنے رب کی نافرمانی کی تو ایک ہولناک دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں۔ کہہ دو اگر اللہ کی مشیت ہوتی تو نہ میں اس کو تمہیں سناتا اور نہ اس سے تمہیں باخبر کرتا۔ میں اس سے پہلے تم میں ایک عمر بسر کر چکا ہوں تو کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے۔ اس سے بڑھ کر ظالم اور کون ہوگا جو اللہ پر جھوٹ بہتان باندھے یا اس کی آیات کو جھٹلائے۔ بے شک مجرم فلاح پانے والے نہیں بنیں گے۔ ۱۵ - ۱۷

اور وہ اللہ کے سوا ایسی چیزوں کی پرستش کرتے ہیں جو ان کو نقصان پہنچا سکیں نہ نفع، اور کہتے ہیں کہ یہ اللہ کے ہاں ہمارے سفارشی ہیں۔ کہہ دو، کیا تم اللہ کو ایسی چیز کی خبر دیتے ہو جس کا اس کو خود پتہ نہیں، نہ آسمانوں میں نہ زمین میں۔ وہ پاک اور ارفع ہے ان چیزوں سے جن کو وہ اس کا شریک ٹھہراتے ہیں۔ اور لوگ تو ایک ہی امت تھے، پھر انہوں نے اختلاف کیا۔ اور اگر تمہارے

رب کی جانب سے ایک بات پہلے سے طے نہ پا چکی ہوتی تو ان کے درمیان اس امر میں فیصلہ کر دیا جاتا جس میں وہ اختلاف کر رہے ہیں۔ ۱۸-۱۹

۳۔ الفاظ کی تحقیق اور جملوں کی وضاحت

'ولو یعجل اللہ للناس الشر استعجالھم بالخیر لقضی الیھم اجلھم ط فنذر الذین لا یرجون لقاءنا فی طغیانھم یعمھون' ۱۱

عذاب کے لیے جلد بازی کا جواب

یہ، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، جواب ہے عذاب کے لیے کفار کی جلد بازی کا۔ جب ان کو آیات الٰہی کی تکذیب کے انجام سے ڈرایا جاتا تو وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو زچ کرنے کے لیے فوراً یہ مطالبہ کرتے کہ اگر تم سچے رسول ہو اور تمہارے خیال کے مطابق ہماری تکذیب مستوجب عذاب ہے تو اس عذاب کے لانے میں تاخیر نہ کرو، ہم اس کے دیکھنے کے لیے بے قرار ہیں۔ جواب میں ارشاد ہوا کہ سنت الٰہی یوں ہے کہ اللہ رحمت کرنے میں تو جلدی کرتا ہے لیکن عذاب بھیجنے میں جلدی نہیں کرتا۔ 'استعجالھم بالخیر' میں استعجال ہمارے نزدیک اپنے مفعول کی طرف مضاف ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے یہ دنیا چونکہ اصلاً اپنی رحمت ہی کے لیے خلق فرمائی ہے اس لیے وہ لوگوں پر رحمت نازل بھی فرماتا ہے اور لوگوں سے یہ چاہتا بھی ہے کہ وہ فرصت ختم ہونے سے پہلے پہلے اس کی رحمت کے قدر دان بنیں اور نیکی اور سعادت کی وہ راہ اختیار کریں جو دنیا اور آخرت دونوں میں ان کو خدا کے فضل و رحمت کا مستحق بنائے۔ اس سنت الٰہی کا تقاضا یہ ہے کہ وہ ان لوگوں پر عذاب بھیجنے میں جلدی نہ کرے جو اس کے آگے اکڑتے اور اس کے رسول کی تکذیب کرتے ہیں۔

'فنذر الذین لا یرجون لقاءنا ..... الآیہ' یہ مذکورہ سنت الٰہی کا تقاضا بیان ہوا ہے کہ اس کا تقاضا یہ ہے کہ نافرمانی اور طغیان کے باوجود لوگوں کو زیادہ سے زیادہ مہلت اور ڈھیل دی جائے تاکہ کسی درجے میں بھی اصلاح کا کوئی امکان ہو تو لوگ اپنی اصلاح کر لیں اور اگر اصلاح نہ کریں تو ان پر اللہ کی حجت اس طرح تمام ہو جائے کہ روز آخرت کی پیشی کے وقت، جس سے وہ بالکل بے خبر ہیں، ان کے پاس پیش کرنے کے لیے کوئی عذر باقی نہ رہ جائے۔

'واذا مس الانسان الضر دعانا لجنبہ او قاعدا او قائما فلما کشفنا عنہ ضرہ مر کان لم یدعنا الی ضر مسہ کذالک زین للمسرفین ما کانوا یعملون' ۱۲

'انسان' کا لفظ ہر چند عام ہے لیکن اس سے مراد وہی متمردین قریش ہیں جو عذاب کا مطالبہ کر رہے تھے۔ ان کو لائق خطاب نہیں سمجھا اس وجہ سے بات عام الفاظ میں فرما دی۔ یہ ان کی اس اکڑ پر ایک ضرب بھی

ہے اور اس میں اشارہ اس حقیقت کی طرف بھی ہے کہ کوئی یہ نہ سمجھے کہ اس قسم کے لوگوں کا مطالبۂ عذاب پورا کر دیا جائے تو وہ ایمان لائیں گے۔ اس قسم کے لوگ ایمان نہیں لائیں گے بلکہ ان کا حال یہ ہوتا ہے کہ جب یہ کسی پکڑ میں آتے ہیں تب تو یہ خدا خدا پکارتے ہیں اور سو سو طرح سے توبہ کا عہد و پیمان باندھتے ہیں لیکن جب ذرا ڈھیل مل جاتی ہے تو وہی سرمستی ان پر پھر عود کر آتی ہے اور انہیں یاد بھی نہیں رہتا کہ کبھی پکڑ میں آئے تھے اور انہوں نے اس سے چھوٹنے کے لیے خدا کو پکارا بھی تھا۔ 'کذٰلک زیّن للمسرفین ما کانوا یعملون' یعنی یہ جو کلیہ بیان ہوا ہے یہی ٹھیک ٹھیک ان سرکشوں اور حدود الٰہی سے ان تجاوز کرنے والوں پر منطبق ہوتا ہے۔ یہ جو بداعمالیاں کرتے رہتے ہیں سنت الٰہی کے تحت وہ ان کی نگاہوں میں اس طرح کھبا دی گئی ہیں کہ اگر ان کی طلب کے مطابق کوئی نشانیٔ عذاب ان کو دکھا بھی دی جائے تو اس کی گرفت سے چھوٹتے ہی پھر یہ اسی کیچڑ میں لوٹیں گے جس میں لوٹ رہے ہیں۔

ولقد اھلکنا القرون من قبلکم لما ظلموا وجاءتھم رسلھم بالبینات وما کانوا لیؤمنوا کذٰلک نجزی القوم المجرمین ○ ثم جعلنٰکم خلائف فی الارض لننظر کیف تعملون ○ ۱۳-۱۴

تاریخ کی شہادت

یہ جواب قریش کو مخاطب کر کے تاریخ کی روشنی میں دیا گیا ہے کہ آخر دوسروں کو جو کچھ اسی ملک کی تاریخ کے مختلف ادوار میں پیش آ چکا ہے اس سے سبق کیوں نہیں لیتے۔ یہ کیا ضروری ہے کہ وہی کچھ تم پر گزر جائے تب تمہاری سمجھ میں بات آئے کہ جو کچھ تم سے کہا گیا وہ ٹھیک ہے۔ یہاں حوالہ اجمالی ہے۔ اسی سورہ میں آگے بعض اہم تاریخی واقعات کی تفصیل بھی آ رہی ہے۔ 'لمّا ظلموا' سے مراد یہاں ان قوموں کا وہ ظلم ہے جو انہوں نے اپنے رسولوں کی تکذیب کر کے خود اپنے اوپر ڈھایا۔ 'وجاءتھم رسلھم بالبینٰت وما کانوا لیؤمنوا' اسی ظلم کی تفصیل ہے۔ 'کذٰلک نجزی المجرمین' یعنی جو قومیں اپنے رسولوں کی تکذیب کرتی ہیں ہم ان کو اسی طرح سزا دیا کرتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جب وہی جرم تم کرو گے تو آخر اس کی سزا سے کیسے بچ جاؤ گے۔

'ثم جعلناکم خلائف ..... الآیہ' یعنی جب تم انہی کے جانشین ہوئے ہو تو آخر تمہارے ساتھ اس سے مختلف معاملہ کیوں ہو گا جو ان کے ساتھ ہوا؟ ان کو ہٹا کر خدا نے تم کو ان کی جگہ تو اسی لیے دی تھی کہ دیکھے تم کیا بناتے ہو؟

واذا تتلی علیھم اٰیاتنا بیّنٰت قال الذین لا یرجون لقاءنا ائت بقراٰن غیر ھٰذا او بدّلہ ط قل ما یکون لی ان ابدلہ من تلقاءی نفسی ان اتبع الا ما یوحٰی

الی انی اخاف ان عصیت ربی عذاب یوم عظیم ٥ ۔

یعنی توحید اور آخرت کی یہ باتیں، جو مذکور ہوئیں، نہایت واضح دلائل کے ساتھ ان کو سنائی جاتی ہیں تو یہ ان سے چڑتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ یا تو اس قرآن کی جگہ کوئی اور قرآن لاؤ یا کم از کم اس میں ایسی ترمیم کرو کہ ہمارے لیے گوارا ہو سکے۔ گویا قرآن ان کے نزدیک خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تصنیف ہے کہ آپ اس میں ان کے مطالبے کے مطابق ترمیم و تنسیخ کر سکتے ہیں۔ یہ مطالبہ مخالفین کی شکست خوردگی کی دلیل تھا۔ وہ یہ تو مان چکے تھے کہ قرآن سے اب پیچھا چھڑانا ممکن نہیں رہا۔ اب اگر کوئی شکل باقی ہے تو یہ ہے کہ اس کا مقام تسلیم کرتے ہوئے اس میں ایسی ترمیم کرانے کی کوشش کی جائے جس کے بعد ان کے لیے بھی وہ قابل قبول ہو سکے۔ جواب میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے یہ کہلایا گیا کہ یہ میری کوئی اپنی تصنیف تھوڑی ہی ہے کہ میں اس میں اپنی جانب سے کوئی ترمیم و تنسیخ کر دوں۔ یہ کلام تو مجھ پر خدا کی طرف سے وحی ہوتا ہے اور میں بے چون و چرا اسی وحی کی پیروی کرتا ہوں۔ اگر میں اس میں اپنی طرف سے کوئی رد و بدل کر دوں تو کل کو خدا کے آگے کیا جواب دوں گا۔

مخالفین کی شکست خوردگی

قل لو شاء اللہ ماتلوتہ علیکم ولا ادرٰکم بہ فقد لبثت فیکم عمرا من قبلہ افلا تعقلون ٥ فمن اظلم ممن افترٰی علی اللہ کذبا او کذب بآیاتہ ط انہ لا یفلح المجرمون ٥ ۱۶-۱۷

'ادرٰکم'، 'دری یدری' سے باب افعال اور غائب کا صیغہ ہے۔ فاعل اس کا اللہ ہے۔ بعض لوگوں نے اس کو 'ماتلوتہ' سے ہم آہنگ کرنے کے لیے اس کا ترجمہ متکلم کا کیا ہے لیکن یہ عربیت کے بالکل خلاف ہے۔

اب یہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے کفار کے مطالبے کے پہلے ٹکڑے کا جواب دلوایا ہے۔ یعنی اس بات کا کہ اس قرآن کے بجائے کوئی اور قرآن لاؤ۔ فرمایا کہ تم گمان کرتے ہو کہ میں نے یہ قرآن تمہارے سامنے اپنے شوق سے پیش کیا ہے اور اس رنگ میں میں نے تم پر اپنی سیادت اور نبوت جمانی چاہی ہے۔ تمہارا یہ خیال بالکل غلط ہے۔ میں نے اس بارِ گراں کا نہ کبھی ارمان کیا اور نہ اپنے شوق سے اس کو اٹھایا ہے۔ میں اس ذمہ داری کی گراں باریوں سے سب سے زیادہ بھاگنے والا رہا ہوں۔ لیکن مشیت الٰہی یہی ہوئی کہ میں یہ بوجھ اٹھاؤں۔

بحث جواب

'فقد لبثت فیکم عمرا من قبلہ افلا تعقلون' یہ اوپر والی بات کی ایسی سادہ اور مسکت دلیل ہے کہ کوئی ایماندار آدمی اس کو جھٹلا نہیں سکتا۔ ارشاد ہوا کہ میں تم میں کوئی نووارد آدمی نہیں جس کے ماضی و حاضر سے تم بے خبر ہو۔ میں تمہارے اندر زندگی کے چالیس سال گزار چکا ہوں۔ اس طویل مدت میں کب تم نے میرے اندر سیادت و امارت کی بو محسوس کی ہے، کب تم نے پایا ہے کہ میں اونچے اونچے خواب دیکھتا ہوں اور اپنی بڑائی کی دھونس جمانے کا شوق رکھتا ہوں؟ آدمی کا مزاج راتوں رات نہیں بنتا ہے اور نہ کردار ایسی

چیز ہے جو اتنی طویل باہمی معاشرت کے باوجود نگاہوں سے مخفی رہے جس شخص نے خلق میں سے کسی سے کبھی جھوٹ نہ بولا ہو آخر وہ خالق پر اتنا بڑا جھوٹ باندھنے کی جسارت کیسے کر سکتا ہے ؟ آج تک تم مجھے صادق اور امین سمجھتے رہے تو اب میں راتوں رات برخود غلط، خود نما، لپاٹیا اور مفتری کیسے بن گیا؟ خدا کے بندو عقل سے کام لو، انصاف سے غور کرو اور ضد و عناد میں اندھے نہ بن جاؤ ——— اس سے معلوم ہوا کہ حضرات انبیاءؑ کی زندگی شرف رسالت سے ممتاز ہونے سے پہلے بھی ایسی بے داغ ہوتی ہے کہ ان کے مخالفین اس پر انگلی رکھنے کی کوئی گنجائش نہیں پاتے اور یہ چیز ان کے دعوے کی صداقت کی ایک بہت بڑی دلیل ہوتی ہے۔

رسول کے لیے غلبہ لازمی ہے

"فمن اظلم ممن افتری ..... الآیہ" یعنی اگر میں خدا پر افترا کر رہا ہوں اور جھوٹا دعوائے نبوت لے کر اٹھا ہوں تو مجھ سے بڑا کوئی ظالم نہیں اور اگر میں سچا ہوں اور تم اللہ کی آیات کو جھٹلا رہے ہو تو تم سے بڑا کوئی ظالم نہیں۔ اب مستقبل فیصلہ کرے گا کہ ظالم تم ہو یا میں۔ یہ یاد رکھو کہ جو مجرم ہوں گے وہ فلاح نہیں پائیں گے ——— یہاں وہ بات یاد رکھنے کی ہے جس کی طرف ہم پیچھے اشارہ کر آئے ہیں کہ اللہ کے رسولوں اور ان کے مخالفین کے مابین حق و باطل کی جو کشمکش برپا ہوتی ہے وہ لازماً حق کے غلبہ پر منتہی ہوتی ہے اس لیے کہ رسول خدا کی عدالت ہوتا ہے اور اس کے لیے بفحوائے "لاغلبن انا ورسلی" آخرت سے پہلے اس دنیا میں بھی غلبہ لازمی ہے۔

ویعبدون من دون اللہ مالا یضرھم ولا ینفعھم ویقولون ھؤلاء شفعاءنا عند اللہ قل اتنبئون اللہ بما لا یعلم فی السمٰوٰت ولا فی الارض ط سبحانہ وتعالیٰ عما یشرکون ۝ وما کان الناس الا امۃ واحدۃ فاختلفوا ولولا کلمۃ سبقت من ربک لقضی بینھم فیما فیہ یختلفون۔ ۱۸-۱۹

مشرکین مکہ کی اصل پکڑ

"ویعبدون من دون اللہ ..... الآیہ" یہ اس خاص چیز کا حوالہ بھی ہے جس کے سبب سے مشرکین مکہ قرآن سے چڑتے اور اس میں ترمیم کا مطالبہ کرتے تھے اور اللہ پر افترا کی ایک مثال بھی ہے جو دلیل ہے اس بات کی کہ عند اللہ سب سے بڑے ظالم یہی ہیں اس لیے کہ یہ ایسی چیزوں کی بندگی کرتے ہیں جو ان کو ضرر پہنچا سکیں نہ نفع اور ان کی نسبت یہ دعوے کرتے ہیں کہ یہ اللہ کے ہاں ہماری سفارشی ہیں، دنیا میں ہمیں آل و اولاد اور رزق و مال جو کچھ ملتا ہے انہی کی سفارش سے ملتا ہے اور اگر آخرت ہوئی تو وہاں بھی یہ ہمیں بخشوائیں گی۔ یہ بات یہاں یاد رکھنے کی ہے کہ اہل عرب اپنے معبودوں کو نہ خدا کی ذات میں شریک مانتے تھے نہ کسی کو خالق و مالک کا درجہ دیتے تھے بلکہ صرف ان کو خدا کے جہتیوں کا درجہ دیتے اور ان کی سفارش کی

کی امید پر ان کی پرستش کرتے تھے۔

عربیت کا ایک خاص اسلوب

قل اتنبئون اللہ بما لا یعلم فی السمٰوٰت ولا فی الارض ‘ یہ نفی الشئ بنفی لازمہ کے اسلوب پر ان فرضی سفارشیوں کی تردید ہے۔ یعنی ان کے ان فرضی سفارشیوں کا آسمان وزمین میں کوئی وجود ہوتا تو سب سے زیادہ ان سے باخبر تو خود اللہ تعالےٰ ہوتا جس کے وہ مقرب اور چہیتے ٹھہرائے جاتے ہیں لیکن خدا کو تو ان کا کوئی پتہ نہیں ہے۔ بس یہی لوگ ان کا سراغ بھی دے رہے ہیں اور یہی ان کو آسمان پر بھی چڑھا رہے ہیں۔ بعینہٖ یہی مضمون رعد آیت ۳۳ میں بھی ہے۔ وجعلوا للہ شرکاء ط قل سموھم ط ام تنبئونہ بما لا یعلم فی الارض ام بظاھر من القول (اور انہوں نے اللہ کے شریک ٹھہرائے ہیں، ان سے کہو کہ ذرا ان کے نام تو لو، کیا تم اس کو ایسی چیز کا پتہ دے رہے ہو جس کے زمین میں وجود کا اس کو خود علم نہیں یا یوں ہی ہوائی بات کر رہے ہو) عربیت کے اس اسلوب کی مثالیں کلام عرب میں موجود ہیں۔ امرؤالقیس نے ایک صحرائی راستہ کی تعریف کی ہے کہ ’لا یھتدی بمنارہ‘ اس کی برجیوں سے رہنمائی نہیں حاصل کی جاتی۔ جس کا صریح مفہوم یہ ہے کہ اس میں برجیاں اور مینارے سرے سے موجود ہی نہیں ہیں، اگر ہوتے تو لازماً ان سے رہنمائی حاصل کی جاتی۔

رد شرک کی ایک دلیل

’سبحٰنہ وتعالٰے عما یشرکون‘ ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں کہ یہ صرف تنزیہ کا کلمہ نہیں ہے بلکہ رد شرک کی ایک بہت بڑی دلیل بھی ہے۔ وہ یوں کہ کسی شے کی بنیادی صفات کے ساتھ کسی ایسی صفت کا جوڑ ملانا خلاف عقل ہے جس سے بنیادی صفات میں سے کسی صفت کی نفی ہوتی ہو یا اس سے کوئی تضاد لازم آتا ہو۔ شرک ہر شکل میں یا تو خدا کی بنیادی مسلّم صفات میں سے کسی صفت کی نفی کرتا ہے یا اس سے تضاد لازم آتا ہے۔

توحید کے حق میں تاریخ کی شہادت

’وما کان الناس الا امۃ واحدۃ فاختلفوا‘ یہ توحید کے حق میں تاریخی دلیل ہے کہ اللہ تعالےٰ نے ہمیشہ اپنے نبیوں اور رسولوں کے ذریعہ سے لوگوں کو ایک ہی دین توحید کی تعلیم دی اور ایک ہی امت بنایا۔ لیکن لوگوں نے بعد میں اس میں اختلاف پیدا کر کے کج پیچ کی بہت سی راہیں نکال لیں اور مختلف امتوں اور گروہوں میں بٹ گئے۔ مطلب یہ ہے کہ آج شرک وضلالت کے مختلف طریقوں کی موجودگی سے کوئی یہ دلیل نہ پکڑے کہ یہ راستے بھی خدا اور رسول کے بتائے ہوئے ہیں۔ ان کو خدا سے کوئی تعلق نہیں بلکہ یہ گمراہوں کی اپنی ایجاد سے ظہور میں آئے ہیں۔ ضمناً اس سے جدید فلسفیوں کے اس نظریہ کی بھی تردید ہوگئی کہ انسان نے دین کا آغاز شرک سے کیا پھر درجہ بدرجہ ارتقاء کرتے ہوئے توحید تک پہنچا۔ قرآن اس کے بالکل برعکس یہ کہتا ہے کہ خدا نے شروع ہی سے انسان کو توحید کی تعلیم دی لیکن گمراہوں نے اس میں اختلاف پیدا کر کے شرک کے فتنے کھڑے کر دیئے۔ ہم نے فلسفۂ جدید کے اس باطل نظریہ کی تردید اپنی کتاب ’حقیقت توحید‘ میں تفصیل سے کی ہے۔

"ولولا کلمۃ ... الآیہ" یعنی اس اختلاف کے فیصلہ کے لیے آخرت کا دن خدا کی طرف سے مقرر ہو چکا ہے۔ اگر یہ دن مقرر نہ ہو چکا ہوتا تو آج ہی ان کے درمیان فیصلہ کر دیا جاتا۔

۴۔ آگے کا مضمون۔ آیات ۲۰۔۲۷

آگے کفار کے مطالبۂ عذاب کا حوالہ دے کر اس کا جواب دیا ہے کہ یہ لوگ عذاب کی کوئی نشانی مانگتے ہیں اور وعدہ کرتے ہیں کہ اس طرح کی کوئی نشانی ان کو دکھا دی گئی تو وہ ضرور ہی ایمان لائیں گے لیکن حالت یہ ہے کہ اس طرح کی کوئی نشانی ظاہر ہوتی ہے تو جب تک اس کی گرفت میں ہوتے ہیں اس وقت تک تو انہیں خدا یاد رہتا ہے لیکن جونہی ذرا ڈھیل ملی تو پھر اپنی سرمستیوں میں اس طرح کھو جاتے ہیں گویا کوئی بات سرے سے پیش ہی نہیں آئی۔ ایسے لوگوں کو کوئی مزید نشانی دکھانے سے کیا حاصل؟

پھر کفار کا یہ مغالطہ دور فرمایا ہے کہ آج تمہارے حالات ساز گار ہیں اور ہر طرف فراغت و فارغ البالی کے سروسامان کی فراوانی ہے تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ اب تم خدا کی گرفت سے باہر ہو اور تمہیں کوئی گزند پہنچ ہی نہیں سکتا۔ خدا کے قہر کی بجلی تو اس وقت گرتی ہے جب مستحق عذاب قوم اپنے حالات میں اتنی مگن ہوتی ہے کہ وہ یہ سمجھنے لگتی ہے کہ اب آسمان یا زمین سے کوئی خطرہ اسے پیش آ ہی نہیں سکتا۔ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۲۰۔۲۷

وَيَقُولُونَ لَوْلَا أُنْزِلَ عَلَيْهِ آيَةٌ مِنْ رَبِّهِ ۖ فَقُلْ إِنَّمَا الْغَيْبُ لِلَّهِ فَانْتَظِرُوا ۖ إِنِّي مَعَكُمْ مِنَ الْمُنْتَظِرِينَ ﴿٢٠﴾ وَإِذَا أَذَقْنَا النَّاسَ رَحْمَةً مِنْ بَعْدِ ضَرَّاءَ مَسَّتْهُمْ إِذَا لَهُمْ مَكْرٌ فِي آيَاتِنَا ۚ قُلِ اللَّهُ أَسْرَعُ مَكْرًا ۚ إِنَّ رُسُلَنَا يَكْتُبُونَ مَا تَمْكُرُونَ ﴿٢١﴾ هُوَ الَّذِي يُسَيِّرُكُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ۖ حَتَّىٰ إِذَا كُنْتُمْ فِي الْفُلْكِ ۖ وَجَرَيْنَ بِهِمْ بِرِيحٍ طَيِّبَةٍ وَفَرِحُوا بِهَا جَاءَتْهَا رِيحٌ عَاصِفٌ وَجَاءَهُمُ الْمَوْجُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَظَنُّوا أَنَّهُمْ أُحِيطَ بِهِمْ ۙ دَعَوُا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ ۖ لَئِنْ أَنْجَيْتَنَا مِنْ هَٰذِهِ لَنَكُونَنَّ مِنَ الشَّاكِرِينَ ﴿٢٢﴾ فَلَمَّا أَنْجَاهُمْ إِذَا هُمْ يَبْغُونَ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ۗ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّمَا بَغْيُكُمْ عَلَىٰ أَنْفُسِكُمْ ۖ مَتَاعَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ۖ ثُمَّ إِلَيْنَا مَرْجِعُكُمْ فَنُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿٢٣﴾ إِنَّمَا مَثَلُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا كَمَاءٍ أَنْزَلْنَاهُ مِنَ السَّمَاءِ فَاخْتَلَطَ بِهِ نَبَاتُ الْأَرْضِ مِمَّا يَأْكُلُ النَّاسُ وَالْأَنْعَامُ ۖ حَتَّىٰ إِذَا

اَخَذَتِ الْاَرْضُ زُخْرُفَهَا وَازَّيَّنَتْ وَظَنَّ اَهْلُهَآ اَنَّهُمْ قٰدِرُوْنَ عَلَيْهَآ اَتٰىهَآ اَمْرُنَا لَيْلًا اَوْ نَهَارًا فَجَعَلْنٰهَا حَصِيْدًا كَاَنْ لَّمْ تَغْنَ بِالْاَمْسِ ؕ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ۝ وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلٰى دَارِ السَّلٰمِ ۬ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰى وَزِيَادَةٌ ؕ وَلَا يَرْهَقُ وُجُوْهَهُمْ قَتَرٌ وَّلَا ذِلَّةٌ ؕ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ كَسَبُوا السَّيِّاٰتِ جَزَآءُ سَيِّئَةٍ بِمِثْلِهَا ۙ وَتَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ ؕ مَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ عَاصِمٍ ۚ كَاَنَّمَآ اُغْشِيَتْ وُجُوْهُهُمْ قِطَعًا مِّنَ الَّيْلِ مُظْلِمًا ؕ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝۔

اور وہ کہتے ہیں ان پر ان کے رب کی جانب سے کوئی نشانی کیوں نہیں اتاری جاتی ؟ تو تم جواب دے دو کہ غیب کا علم تو بس اللہ ہی کو ہے تو تم لوگ انتظار کرو، میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرنے والوں میں ہوں۔ اور انسان کا حال یہ ہے کہ جب کسی تکلیف کے بعد، جو اس کو پہنچی ہو، ہم اسے اپنے کسی فضل سے نوازتے ہیں تو وہ ہماری نشانیوں کے باب میں چالیں چلنے لگتا ہے۔ کہہ دو، خدا اپنی تدبیروں میں کہیں زیادہ تیز ہے۔ جو چالیں تم چل رہے ہو فرشتے ان کو نوٹ کر رہے ہیں۔ ۲۰-۲۱

وہی ہے جو تمہیں خشکی اور تری میں سفر کراتا ہے۔ یہاں تک کہ جب تم کشتی میں ہوتے ہو اور کشتیاں ہوائے موافق سے چل رہی ہوتی ہیں اور وہ اس میں مگن ہوتے ہیں کہ دفعتہً ایک باد تند آتی ہے اور ان پر ہر جانب سے موجیں اٹھنے لگتی ہیں اور وہ گمان کرنے لگتے ہیں کہ ہم ہلاک ہوئے تو وہ اللہ کو پکارتے ہیں خالص اسی کی اطاعت کا عہد کرتے ہوئے کہ اگر تو نے ہمیں اس آفت سے نجات دی تو ہم تیرے شکر گزار بندوں میں سے ہو کر رہیں گے تو جب وہ ان کو نجات دے دیتا ہے وہ نجات پاتے ہی زمین میں، بلا کسی حق کے، سرکشی کرنے لگتے ہیں۔ لوگو، تمہاری سرکشی کا وبال تمہارے ہی اوپر آنے والا ہے۔ چند دن دنیا کی زندگی کا نفع اٹھا لو، پھر تمہاری واپسی ہماری ہی طرف ہے، پھر ہم تمہیں تمہاری کرتوتوں سے آگاہ کریں گے۔ اس دنیا کی زندگی کی تمثیل یوں ہے جیسے بارش کہ ہم نے اسے آسمان سے برسایا پس اس سے زمین کی نباتات خوب اگیں، وہ بھی جن کو لوگ کھاتے ہیں اور وہ بھی جن کو چوپائے کھاتے ہیں۔ یہاں تک کہ جب زمین نے اپنا پورا بناؤ سنگار کر لیا اور زمین والوں نے گمان کیا کہ اب

معاملہ ہمارے قابو میں ہے تو دفعتہً اس پر ہمارا قہر رات کو یا دن کو آ دھمکا اور ہم نے اس طرح اس کا ستھراؤ کر دیا کہ گویا کل کچھ تھا ہی نہیں۔ اسی طرح ہم اپنی نشانیوں کی تفصیل کرتے ہیں ان لوگوں کے لیے جو غور کریں۔ ۲۲-۲۴

اور اللہ امن و سلامتی کے گھر کی طرف بلاتا ہے اور جس کو چاہتا ہے سیدھی راہ کی ہدایت دیتا ہے۔ جن لوگوں نے اچھے کام کئے ان کے لیے اچھا بدلہ ہے اور اس پر مزید بھی اور ان کے چہروں پر نہ سیاہی چھائے گی اور نہ ذلت۔ یہی جنت والے لوگ ہیں، وہ اسی میں ہمیشہ رہیں گے۔ اور جنہوں نے بدیاں کمائی ہوں گی تو برائی کا بدلہ اس کے مثل ہے اور ان پر ذلت چھائی ہوئی ہوگی، اللہ سے ان کو کوئی بچانے والا نہ ہوگا۔ گویا ان کے چہرے شب دیجور کے ٹکڑوں سے ڈھانک دیئے گئے ہیں۔ یہی لوگ اہل دوزخ ہیں، یہ اسی میں ہمیشہ رہیں گے۔ ۲۵-۲۷

۵۔ الفاظ کی تحقیق اور جملوں کی وضاحت

ویقولون لولا انزل علیہ اٰیۃ من ربہ فقل انما الغیب للّٰہ فانتظروا انی معکم من المنتظرین۔ ۲۰

مطالبہ عذاب کا جواب

'آیت' سے یہاں قرینہ دلیل ہے کہ نشانی عذاب مراد ہے۔ قرآن ان کو دو عذابوں کی خبر دے رہا تھا۔ ایک رسول کی تکذیب کی صورت میں اس دنیا میں۔ دوسرا عدم ایمان کی صورت میں آخرت میں۔ سادات قریش کے پندار پر اس سے بڑی چوٹ پڑتی تھی اور یہ چیز بھی منجملہ ان چیزوں کے تھی جن کی وجہ سے وہ قرآن کے بدلنے یا اس میں ترمیم کا مطالبہ کرتے تھے۔ اس باب میں وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو زچ کرنے کے لیے یہ کہتے کہ اگر یہ اپنی اس دھمکی میں سچے ہیں تو آخر یہ اس عذاب کا نمونہ دکھاتے کیوں نہیں جس کی اس شدّ و مدّ سے منادی کرتے پھر رہے ہیں۔ جواب میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے کہلوایا گیا کہ عذاب لانا میرا کام نہیں ہے۔ عذاب کی خبر خدا نے دی ہے میں تم کو اس سے خبردار کر رہا ہوں، رہی یہ بات کہ عذاب کب اور کس شکل میں آئے گا تو یہ امور غیب ہیں ان کا علم صرف اللہ ہی کو ہے۔ فانتظروا انی معکم من المنتظرین، اگر تم اس کے طلب گار ہو تو انتظار کرو میں بھی خدا کی دی ہوئی خبر کی بنا پر اس کے انتظار میں ہوں۔ "انتظار میں ہوں" سے یہ مقصد نہیں ہے کہ آپ کو اپنی قوم کو مبتلائے عذاب الٰہی دیکھنے کا ارمان تھا۔ حضرات انبیاؑ اپنی قوم کو عذاب سے بچانے کے لیے اپنا ایڑی چوٹی کا زور صرف کر دیتے ہیں لیکن جب قوم اپنی ضد کے سبب سے اپنے اندر وہ تمام اسباب و علامات جمع کر لیتی ہے جن کے بعد عذاب آیا کرتا ہے تو قدرتی طور پر نبی کے دل کو بھی ہر وقت کھٹکا لگا رہتا ہے کہ اب مریض کا دم واپسیں ہے اور خدا کا حکم آیا ہی چاہتا ہے۔ اس انتظار میں تمنا کا کوئی دخل نہیں ہوتا

بلکہ یہ حسرت و اندوہ کے ساتھ ایک امر شدنی کا انتظار ہوتا ہے ۔

وإذا أذقنا الناس رحمة من بعد ضراء مستهم إذا لهم مكر في آياتنا ط

قل الله أسرع مكرا ط إن رسلنا يكتبون ما تمكرون ۔ ۲۱

قریش کی چالیں

' وإذا أذقنا الناس ' یہ حال تو قریش ہی کا بیان ہو رہا ہے لیکن بات عام خطاب کے اسلوب میں کہہ دی گئی ہے تاکہ ان سے بے التفاتی کا اظہار بھی ہو جائے اور یہ حقیقت بھی سامنے آجائے کہ اس باب خاص میں جو حال ان کا ہے وہی حال سب کا ہے ۔ صرف صاحب توفیق ہی ہوتے ہیں جو اس سے الگ روش اختیار کرتے ہیں ۔ فرمایا کہ اس قسم کی تنبیہی نشانیاں جو لوگوں کو دکھائی جاتی ہیں ، ان کا کچھ اثر بس اسی وقت تک رہتا ہے جب تک لوگ اس کی زد میں رہتے ہیں ۔ جونہی حالات بدلے ، محسوس ہوا کہ کشتی گرداب سے باہر نکل آئی ، فوراً لیڈر اپنے عوام کے دلوں پر سے اس ابتلاء کے تمام اثرات مٹانے کے لیے طرح طرح کے فلسفے بیان کرنا شروع کر دیتے ہیں اور مختلف قسم کی چالوں سے خود بھی اپنی پچھلی سرمستیوں میں کھو جاتے ہیں اور اپنی قوم کو بھی اپنے ساتھ ہانک لے جاتے ہیں ۔

' إذا لهم مكر في آياتنا ' لفظ ' مکر ' کی تحقیق آل عمران کی آیت ' مکروا ومکر اللہ ' کے تحت بیان ہو چکی ہے ۔ ' مکر ' کے معنی خفیہ تدبیر اور چالبازی کے ہیں ۔ اللہ تعالیٰ کی ان نشانیوں کے باب میں کفار نے جو چالبازی کی اس کی ایک مثال تو یہیں آگے والی آیت میں بیان ہوئی ہے ۔ لئن أنجيتنا من هذه لنكونن من الشاكرين ، فلما أنجاهم إذا هم يبغون في الأرض (اگر تو نے ہم کو اس ہلاکت سے نجات دے دی تو ہم تیرے شکر گزار بندے بن کر رہیں گے لیکن جب ان کو نجات دے دی تو پھر وہ زمین میں سرکشی کرنے لگے) دوسری مثال اس کی ' قد مس آباءنا الضراء والسراء ' والی آیت میں بیان ہوئی ہے ۔ یعنی ان کے لیڈر اپنے کو تسلی دینے اور اپنے عوام کو مطمئن کرنے کے لیے اپنے ضمیر کے بالکل خلاف تاریخ کا یہ فلسفہ بیان کرنا شروع کر دیتے ہیں کہ اس قسم کے نرم و گرم حالات تو قوموں کی زندگی میں ہمیشہ آیا ہی کرتے ہیں ، ہمارے بزرگوں کو بھی پیش آئے ، ہمیں بھی پیش آ رہے ہیں ، ان کو خواہ مخواہ یہ اہمیت کیوں دی جائے کہ یہ خدا کی طرف سے بطور تنبیہ پیش آئے ہیں یا ان کا کوئی تعلق ہمارے اعمال و عقائد سے ہے ۔

' قل الله أسرع مكرا ' ' مکر ' کی نسبت جب اللہ تعالیٰ کی طرف ہوتی ہے تو اس کا مفہوم خفیہ تدبیر ہو جاتا ہے ۔ ہم آل عمران کی مذکورہ بالا آیت کے تحت اس کے مختلف پہلوؤں کی وضاحت کر آئے ہیں ۔ آیت کا مفہوم یہ ہے کہ تم چالیں چلنی چاہتے ہو تو خوب چل لو ، خدا نے تم کو جو یہ ڈھیل دے رکھی ہے تو اس وجہ سے دے رکھی ہے کہ اس کو اپنی تدبیر کے بروئے کار لانے میں کوئی وقت صرف نہیں کرنا پڑتا ہے ۔ اس

کی تدبیر آناً فاناً بروئے کار آتی ہے اور اتنی محکم ہوتی ہے کہ کوئی اس سے بچ کے نکل نہیں سکتا۔ ان رسلنا یکتبون ما تمکرون۔ 'رسل' سے یہاں مراد فرشتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ تمہاری ایک ایک چال ہمارے فرشتے نوٹ کر رہے ہیں۔ کوئی چیز ہم سے مخفی نہیں۔ وقت آنے پر ہم اس کا نوٹس لیں گے پھر تمہاری ساری چالیں دھری کی دھری رہ جائیں گی۔

هو الذی یسیرکم فی البر والبحر حتی اذا کنتم فی الفلک وجرین بهم بریح طیبة و فرحوا بها جاءتها ریح عاصف وجاءهم الموج من کل مکان وظنوا انهم احیط بهم دعوا الله مخلصین له الدین لئن انجیتنا من هذه لنکونن من الشاکرین ۵ فلما انجاهم اذا هم یبغون فی الارض بغیر الحق ط یا ایها الناس انما بغیکم علی انفسکم متاع الحیوة الدنیا ثم الینا مرجعکم فننبئکم بما کنتم تعملون ۵ ۲۲-۲۳

'یسیرکم' 'تسییر' کے معنی چلانے کے ہیں۔ یہاں یہ سفر کرانے کے معنی میں آیا ہے۔ چونکہ تمام وسائل و ذرائع خدا ہی کے پیدا کردہ ہیں اور وہ تدبیر و حکمت بھی خدا ہی کی عطا کردہ ہے جس سے کام لے کر انسان خشکی و تری میں سفر کے وسائل ایجاد کرتا اور ان سے فائدہ اٹھاتا ہے اس وجہ سے فرمایا کہ وہی تمہیں خشکی و تری میں سفر کراتا ہے تاکہ انسان کی نگاہ اسباب و وسائل ہی میں اٹک کے نہ رہ جائے بلکہ اسباب و وسائل پیدا کرنے والے تک پہنچے۔

آیت کے اجزا کی تشریح

'فی الفلک' 'فلک' کے معنی کشتی کے ہیں۔ ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں کہ یہ مذکر، مؤنث واحد، جمع سب کے لیے آتا ہے۔ چنانچہ یہاں اس کے لیے فعل 'جرین' جمع استعمال ہوا ہے۔

'وجرین بهم بریح طیبة' 'ریح طیبہ' سے سازگار ہوا مراد ہے۔ اس کا مقابل لفظ 'ریح عاصف' استعمال ہوا ہے جو طوفانی ہوا کے لیے آتا ہے۔ اوپر سے بات صیغۂ خطاب میں آ رہی تھی۔ یہاں سے اسلوب غائب کا ہو گیا۔ اس لیے کہ یہ تمثیل ہے اور تمثیل کے لیے اسلوب بیان عمومی ہی موزوں اور مؤثر ہوتا ہے۔

'و بغوا فی الارض بغیر الحق' 'بغی' استکبار کا نتیجہ ہوتی ہے اور استکبار صرف اس کے لیے روا ہے جس کا خلق و تدبیر میں کوئی حصہ ہو۔ جو خود مخلوق اور ہر چیز میں خالق کے رحم و کرم کا محتاج ہو اس کے اکڑنے اور وہ بھی اپنے خالق کے سامنے کے کیا معنی؟ اس وجہ سے یہ بغی بغیر حق ہے۔

'یا ایها الناس' میں خطاب پھر قریش سے ہو گیا اور 'متاع الحیوة' میں لفظ 'متاع' فعل محذوف سے منصوب ہے۔

ایک حقیقت اور اس کی تمثیل

اجزا کی تشریح کے بعد اب نفس آیت کے مفہوم پر غور فرمائیے۔ یہ اوپر والی آیت میں بیان کردہ حقیقت کی تمثیل ہے۔ اوپر فرمایا تھا کہ انسان کا حال یہ ہے کہ جب ہم اس کو کسی دکھ کے بعد سکھ پہنچاتے ہیں تو وہ ہماری نشانیوں سے صحیح فائدہ اٹھانے کے بجائے ہم سے چال بازیاں کرتا ہے۔ اسی حقیقت کو انسانی زندگی کے ایک عامۃ الورود واقعہ سے مثال دے کر سمجھایا ہے کہ جس طرح ایک کشتی کے مسافر سفر پر روانہ ہوتے ہیں تو جب ہوا موافق ہوتی ہے اور کشتی نہایت سکون سے اپنی منزل کی طرف رواں دواں ہوتی ہے تو سب مگن ہوتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اب ان کی اس خوشی میں کوئی خلل انداز ہو ہی نہیں سکتا۔ لیکن زیادہ وقت نہیں گزرتا کہ کسی گوشے سے طوفانی ہوا اٹھتی ہے اور موجوں کے تھپیڑوں سے کشتی اس طرح ہچکولے کھانے لگتی ہے کہ ہر شخص یہ گمان کرنے لگتا ہے کہ اب ڈوبی کہ تب۔ اس نازک وقت میں سب خدا سے دعا و فریاد اور یہ عہد کرتے ہیں کہ اب اگر اس ورطۂ ہلاکت سے خدا نے نجات دے دی تو ہم آئندہ اس کے شکرگزار اور فرمانبردار بندے بن کر زندگی بسر کریں گے لیکن جب خدا ان کو اس گردش سے نجات دے دیتا ہے تو اپنا یہ عہد بھول کر پھر اپنی پچھلی سرمستیوں اور شرارتوں میں کھو جاتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ یہی حال اس وقت ان لوگوں کا ہے جو عذاب کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ اس وقت زندگی کا سفینہ نہایت سکون سے رواں ہے۔ حالات سازگار ہیں۔ اس وجہ سے اپنی شرارتوں میں مگن ہیں۔ پیغمبر ان کو خدا کی پکڑ سے ڈراتا ہے تو ان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آرہی ہے کہ عذاب کیوں آجائے گا اور کدھر سے آجائے گا۔ چنانچہ بڑی ڈھٹائی سے پیغمبر کو چیلنج کر رہے ہیں۔ لیکن جب کسی گرفت میں آجائیں گے تو توبہ توبہ پکاریں گے لیکن وہ اپنی اس توبہ پر صرف اس وقت تک قائم رہیں گے جب تک گرفت میں رہیں گے۔ گرفت سے باہر ہوتے ہی پھر اس طرح اکڑنے لگیں گے گویا خدا کی خدائی سے باہر ہو گئے۔ مدعا یہ کہ کوئی یہ نہ خیال کرے کہ اس طرح کے لوگوں کو کسی تنبیہ سے کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے ان کے دلوں کا زنگ کسی رگڑ سے بھی دور نہیں ہوتا۔ اس طرح کے اشقیا صرف خدا کے فیصلہ کن عذاب ہی کے حوالہ ہوتے ہیں۔

قریش کو تہدید

یا ایھا الناس، تمثیل کے بعد یہ قریش کو پھر خطاب کیا ہے اور یہ خطاب اپنے اندر نہایت سخت تہدید و وعید رکھتا ہے۔ انما بغیکم علی انفسکم، یعنی تمہاری اس شرارت و سرکشی سے نہ خدا کا کچھ بگڑے گا نہ رسول کا۔ بگڑے گا تمہارا ہی۔ تمہاری ہر سرکشی تم پر خدا کی حجت پوری کرے گی اور تم جتنے قدم اس راہ میں بڑھو گے اتنے ہی خدا کے فیصلہ کن عذاب سے قریب سے قریب تر ہو گے۔ 'متاع الحیوۃ الدنیا' یعنی اس دنیا کے جس سروسامان پر ریجھے ہوئے ہو اس سے کچھ دن فائدہ اٹھا لو لیکن یاد رکھو کہ واپسی ہماری ہی طرف ہے، کسی اور کی طرف نہیں ہے، اس وقت ہم تمہارا سارا کچا چٹھا تمہارے سامنے رکھ دیں گے اور تمہارا کوئی سفارشی تمہارے کچھ کام نہ آئیگا۔

انما مثل الحیوۃ الدنیا کماء انزلناہ من السماء فاختلط بہ نبات الارض مما

یأکل الناس والانعام حتیٰ اذا اخذت الارض زخرفها وازّینت وظن اهلها انهم
قادرون علیها اتاها امرنا لیلاً اونهارا فجعلنٰها حصیدا کان لم تغن بالامس
کذٰلك نفصل الآیات لقوم یتفکرون ۵ ۲۴

'انما مثل الحیٰوة الدنیا' یہ اس حیات دنیا کی تمثیل ہے جس کا ذکر اوپر والی آیت میں 'متاع الحیٰوة الدنیا' کے الفاظ سے ہوا ہے جس پر کفار ریجھے ہوئے اور اس کو اس قدر مامون سمجھے ہوئے تھے کہ اس میں کسی رخنے کا ان کو امکان ہی نظر نہیں آتا تھا۔

'فاختلط به نبات الارض مما یاکل الناس والانعام' 'اختلاط' کے معنی کسی شے کے باہم گرل جانے اور گتھم گتھا ہوجانے کے ہیں۔ یہ فصلوں اور نباتات کے خوب اپجنے کی تعبیر ہے اس لیے کہ سازگار بارش سے جب فصل نشوونما پاتی ہے تو وہ باہم گرل کر خوب گھنی ہوجاتی ہے۔ 'مما یاکل الناس والانعام' یعنی ہر نوع کی نباتات خوب اپجیں' وہ بھی جو انسانوں کے کام آتی ہیں اور وہ بھی جو مویشیوں کے مصرف کی ہوتی ہیں

'وظن اهلها انهم قدرون علیها' یعنی جب فصل اپنے جوبن پر ہوتی ہے، ان کے مالکوں کے دل حوصلہ اور امنگ سے لبریز ہوجاتے ہیں کہ اب کیا اندیشہ ہے، اب تو بازی ہماری ہے۔

'اتاها امرنا لیلاً اونهاراً فجعلنٰها حصیدا کان لم تغن بالامس' 'امر' یہاں عذاب کے مفہوم میں ہے۔ 'لیلاً اونہاراً' یعنی رات میں یا دن میں جس وقت بھی ہم نے چاہا اپنا عذاب بھیج دیا، کوئی ہمارا ہاتھ پکڑنے والا نہیں تھا۔ 'حصید' کاٹی ہوئی فصل کو کہتے ہیں۔ 'کان لم تغن بالامس' یعنی اس طرح ستھراؤ کردیا کہ گویا کہ ان تلوں میں کبھی تیل ہی نہ تھا۔

آیت کا مفہوم یہ ہے کہ یہ دنیا کی زندگی جس کو تم بہت کامیاب اور مامون سمجھ رہے ہو۔ اس کے غرّے میں خدا کو چیلنج نہ کرو۔ جس طرح دیکھتے ہو کہ بارش ہوتی ہے، فصل اپجتی ہے، باغ پھلتے ہیں، ان کے مالک ان کو دیکھ کر پھولے نہیں سماتے کہ دفعۃً قہر الٰہی کا کوئی جھونکا آتا ہے اور سب کو خس و خاشاک کی طرح اڑا دیتا ہے، اسی طرح جب ہمارا فیصلہ ہوجائے گا ہم تمہیں، عین اسی حالت میں جب کہ تم اپنی ترقی اور عروج کا دور خیال کئے بیٹھے ہو، دھر لیں گے اور تم ہمارے مقابلہ میں کچھ نہ کر سکو گے۔ تم عذاب کی نشانی دیکھنا چاہتے ہو تو اس زمین میں جو نشانیاں ہماری آئے دن ظاہر ہوتی رہتی ہیں، ہم ان کی تفصیل تمہیں سنا رہے ہیں۔ جن کے اندر غور کرنے کی صلاحیت ہے وہ ان پر غور کریں۔ عاقل وہ ہے جو دوسروں کے حالات سے سبق لے نہ کہ اس وقت آنکھ کھولے جب خود اپنے سر پہ گزر جائے۔ سورہ قلم کی آیات ۱۷-۲۶ میں باغ والوں کی جو تمثیل بیان ہوئی ہے اس میں بھی یہی حقیقت واضح کی گئی ہے۔ اس سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ جن قوموں پر اللہ کی حجت تمام ہوجاتی ہے ان کو وہ عین دور عروج میں

پکڑ لیتا ہے۔ اس لیے کہ خدا کے ہاں اصلی اہمیت عقائد و اعمال کی ہے نہ کہ مادی اسباب و وسائل کی۔ اگر ایک قوم اخلاقی اعتبار سے گر چکی ہے تو اسباب و وسائل کی فراوانی اس کو سہارا دینے کے بجائے اس کے زوال کی رفتار کو اور تیز کر دیتی ہے۔

واللہ یدعوا الیٰ دارالسلام ط ویھدی من یشاء الیٰ صراط مستقیم ہ للذین احسنوا الحسنیٰ وزیادۃ ط ولا یرھق وجوھھم قتر ولا ذلۃ اولٰئک اصحٰب الجنۃ ھم فیھا خالدون ہ والذین کسبوا السیّاٰت جزاء سیئۃ بمثلھا وترھقھم ذلۃ مالھم من اللہ من عاصم کانما اغشیت وجوھھم قطعا من الیل مظلما ط اولٰئک اصحٰب النار ھم فیھا خالدون۔ ۲۵-۲۷

اچھوں اور بروں دونوں کا انجام

'واللہ یدعوا الیٰ دارالسلام' 'سلام' کے معنی سکھ اور چین کے ہیں۔ اس سے مراد جنت ہے اس لیے کہ وہی ایسی جگہ ہے جہاں پہنچ جانے کے بعد آدمی کے لیے نہ ماضی کا غم ہوگا، نہ مستقبل کا کوئی اندیشہ بلکہ دائمی سکھ اور ابدی چین کی زندگی ہوگی۔ اس لفظ کے استعمال میں یہاں ایک تلمیح ہے اس دنیا کی طرف جس پہ کفار ریجھے ہوئے تھے۔ مطلب یہ ہے کہ تم تو جس زندگی پر فریفتہ ہو وہ ہر وقت خدا کی برق غضب کی زد میں ہے، البتہ خدا تمہیں جس گھر کی دعوت دے رہا ہے وہ ابدی امن و سلامتی کا گھر ہے۔

'ویھدی من یشاء الیٰ صراط مستقیم' لیکن اس گھر کی راہ اختیار کرنا ہر ایک کا نصیبہ نہیں ہے۔ اللہ تعالےٰ اس گھر کو جانے والی سیدھی راہ کی توفیق انہی کو دیتا ہے جن کو چاہتا ہے۔ "جن کو چاہتا ہے" یعنی جو سنت الٰہی کے مطابق اس کے اہل ٹھہرتے ہیں۔ یہ سنت تمام تر عدل اور حکمت پر مبنی ہے۔ اس کی وضاحت ایک سے زیادہ مقامات میں گزر چکی ہے۔

'للذین احسنوا الحسنیٰ وزیادۃ' یہ اس سکھ کے گھر میں لوگوں کے ساتھ اللہ تعالےٰ کے معاملے کی تفصیل ہے کہ جن لوگوں نے دنیا میں نیکی کمائی اور احسان کی روش اختیار کی ہو گی ان کے لیے ان کی نیکی کا بدلہ اچھا بھی ہوگا اور ان پر مزید فضل بھی ہوگا۔ یہاں اس مزید فضل کی وضاحت نہیں ہوئی ہے۔ دوسرے مقام میں اس کی تفصیل یوں آئی ہے 'من جاء بالحسنۃ فلہ عشر امثالھا' ۱۶۰ انعام (جو بھلائی لے کر حاضر ہوگا تو اس کے لیے اس کا دس گنا اجر ہے)

'ولا یرھق وجوھھم قتر ولا ذلۃ' 'رہق' کے معنی چھا جانے اور غالب آجانے کے ہیں اور 'قتر' غبار، کدورت اور سیاہی کو کہتے ہیں۔ یہاں قرینہ دلیل ہے کہ وہ سیاہی مراد ہے جو شدت یاس کے نتیجے میں چہرے پہ چھا جاتی ہے۔ یہاں جن چیزوں کی نفی ہے ان کی نفی سے مقصود ان کے ضد پہلو کا اثبات

فلسفہ و حکمت

کانٹ سے مارکس تک (۱)

—— ازقلم: ——

پروفیسر یوسف سلیم چشتی

تمہید | کانٹ فلسفۂ جدید کا بانی ہے۔ اس کا فلسفیانہ نظام دراصل عقل اور ایمان (Reason & Faith) میں ہم آہنگی کی سعیٔ ناتمام کا دوسرا نام ہے۔
جب اُس نے اپنے نامور ہمعصر اور سکاٹ لینڈ کے سب سے بڑے فلسفی ہیوم کی تصانیف کو غور سے پڑھا تو وہ خود لکھتا ہے کہ "میں خوابِ غفلت سے بیدا ہوگیا اور میری تحقیق کا رخ بالکل بدل گیا"۔ چنانچہ ہیوم کے زبردست منطقی استدلال سے متاثر ہوکر کانٹ نے اعلان کر دیا کہ ہم کسی شئے کی حقیقت سے آگاہ نہیں ہو سکتے۔ اس لا ادریت کا انجام اس بات پر ہوا کہ کانٹ نے تسلیم کر لیا کہ ہم عقل کی رُو سے خدا کی ہستی، اختیارِ انسانی اور نفسِ ناطقہ کی بقا کو ثابت نہیں کر سکتے۔

لیکن عقلی رنگ میں خدا کا انکار کر دینے کے بعد، کانٹ سرکاری یونیورسٹی میں ملازم نہیں رہ سکتا تھا اس لیے اس نے "تنقیدِ عقلِ خالص" میں جو کچھ کہا تھا "تنقیدِ عقلِ عملی" میں اس کی تردید کر دی یعنی خدا کی ہستی اور نفسِ ناطقہ کی بقا کا اقرار کر لیا۔ اس طرح اگرچہ اُس نے عقل اور ایمان میں ہم آہنگی کی کوشش کی مگر اہلِ علم جانتے ہیں کہ کانٹ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ اسی لئے میں نے "سعیٔ ناتمام" کی ترکیب استعمال کی ہے ——— واضح ہو کہ کانٹ کی حالت یہ تھی کہ

ع کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے

عقل کہتی تھی کہ خدا کا وجود، اور بعدِ وفات، نفس کا وجود دونوں باتیں ثابت نہیں ہو سکتیں لیکن دل انکار پہ آمادہ نہیں ہوتا تھا اس لئے اس نے فلسفۂ اخلاق کے دامن میں پناہ لی اور کہا کہ ہمارے ضمیر کی تلقین یہ ہے کہ خدا بھی ہے اور حیات بعد الممات بھی۔

کانٹ نے وفات سے دس سال پہلے ایک کتاب لکھی — "RELIGION WITHIN THE LIMITS OF PURE REASON" — "مذہب، عقل خالص کی حدود میں"۔ گویا آخر عمر میں اس پر دوبارہ "عقل خالص" کا دورہ پڑا اور اس نے عیسائیت کے تحکمانہ عقائد کی تردید کر دی۔ لیکن جب یونیورسٹی نے اسے ایک تہدید آمیز خط لکھا تو اس نے فوراً معذرت نامہ شائع کر دیا اور جب اس کے ایک بے تکلف دوست نے اس کے اس طرز عمل پر حیرت کا اظہار کیا تو اس نے بڑے معصومانہ انداز میں کہا۔ "یہ کوئی ضروری بات تو نہیں ہے کہ انسان جن باتوں کو سچ تسلیم کرتا ہے ان کا اعلان بھی کرے"[1]

الغرض خدا کی ہستی پر عقلی دلائل کا ابطال کر کے کانٹ نے انکار اور تشکیک کا دروازہ کھول دیا اور اس جلتی پر تیل کا کام اس طرح پورا ہو گیا کہ مذہب عیسوی کی بھونڈی تائید کر کے ہیگل نے ارباب علم کو عموماً اور اپنے بعض متبعین کو خصوصاً نفس مذہب ہی سے متنفر کر دیا اور چونکہ عصر حاضر میں، فلسفہ و حکمت کی دنیا میں کانٹ اور ہیگل کو وہی مقام حاصل ہے جو ازمنۂ قدیمہ میں افلاطون اور ارسطو کو حاصل تھا، اس لیے ان دونوں فلسفیوں کے افکار نے مغربی اقوام کے اذہان کو غیر معمولی طور پر متاثر

---

[1] بس یہی فرق ہے ایک فلسفی اور ایک مرد مومن میں۔ مثلاً جب ۱۹۲۱ء میں کراچی کے مشہور خالق دینا ہال میں انگریز جج نے مجاہد اعظم شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی پر یہ الزام عائد کیا کہ آپ "ملک معظم" کی وفادار رعایا کو بغاوت پر آمادہ کرتے ہیں تو اس مرد مومن نے برجستہ یہ جواب دے کر تاریخ کے صفحات پر اپنی قوت ایمانی کا نقش ثبت کر دیا کہ "میں بحمد اللہ مسلمان ہوں اور میرے عقیدے کی رو سے مسلمانوں کا کفار فرنگ کی فوج میں بھرتی ہونا بفحوائے نص قرآنی قطعاً حرام ہے۔ نیز دنیا کی کوئی طاقت مجھے اپنے معتقدات کے برملا اظہار سے باز نہیں رکھ سکتی۔ میں اس عدالت میں بھی اپنے اس عقیدے کا پوری ایمانی قوت کیساتھ اعلان کرتا ہوں اور انشاء اللہ تختہ دار پر بھی یہی کہونگا جو اس وقت کہہ رہا ہوں۔ قرآن مجید واشگاف لفظوں میں حکم دیتا ہے۔ "تعاونوا علی البر والتقوی ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان"۔ اندریں حالات میں مسلمانوں کو ایک دشمن اسلام قوم سے تعاون کا مشورہ کیسے دے سکتا ہوں؟ میرا مذہب مجھے انگریز کے ساتھ تعاون سے منع کرتا ہے"!

جج پر تو اس نعرۂ حق کا کیا اثر ہوتا۔ کہیں پتھر میں بھی جونک لگی ہے؟ ہاں رئیس الاحرار مولانا محمد علی خلد مکانی نے، جو حضرت اقدس کے ساتھ ماخوذ جرم تھے بے ساختہ اپنا سر جانشین احمد ابن حنبل اور امام ابن تیمیہ کے قدموں پر رکھ دیا اور عقیدت کے آنسوؤں کے قیمتی موتی نثار کر دیئے!

کیا اور اس طرح انکار خدا اور انکار مذہب کو، انیسویں صدی کے آخر میں 'اساس الحکمت' کی حیثیت حاصل ہو گئی۔ گویا بقول اقبالؔ ؎

دانشِ حاضر حجابِ اکبر است بت پرست و بت فروش و بت گر است

کانٹ کانٹ کے پیشِ نظر دو اہم مسئلے تھے۔ پہلا مسئلہ تو علم کا تھا اور دوسرا مسئلہ اخلاقی طرزِ عمل کا۔ اور یہ مسائل ہیومؔ کا مطالعہ کرنے کے بعد اس کے دماغ میں پیدا ہوئے اور اسی لئے اس نے یہ اعتراف کیا کہ ہیوم نے مجھے خوابِ غفلت سے بیدار کیا۔" چنانچہ کانٹ نے سب سے پہلے عملِ شعور کی ماہیت پر غور کیا اُس نے کہا کہ خدا کے بارے میں اپنے علم پر یقین کرنے سے پہلے ہم کو یہ معلوم کرنا چاہیئے کہ ہم علم کس طرح حاصل کرتے ہیں۔ کانٹ نے خود ذہنِ مدرک پر بھی تنقیدی نگاہ مبذول کی، جو حصولِ علم کا ایک آلہ ہے۔ اس نے حصولِ علم کے خارجی اور داخلی ذریعہ میں امتیاز کی سعی کی اور وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ ہم کو صرف مظاہر کا شعور حاصل ہو سکتا ہے۔ حقائق کا علم حاصل نہیں ہو سکتا۔ ہم صرف اس دنیا کو جان سکتے ہیں جو ہمارے ذہن سے (بواسطہ حواس) مربوط ہے۔ اشیاء کی حقیقت کو نہ ہم جانچ سکتے ہیں اور نہ اس کا تصوّر کر سکتے ہیں کیونکہ جب ہم حقائق پر بحث کرتے ہیں تو ——— (ANTINOMIES) کا شکار ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ دلائلِ اثباتِ وجودِ باری سب ناقابلِ تسلیم ——— (UN-TENABLE) ہیں۔

خلاصۂ کلام اینکہ کانٹ کے فلسفے کا نتیجہ (UPSHOT) لاادریت ہے۔ چنانچہ خود دینِ مسیمیت کے بارے میں اپنی تصنیف "مذہب عقل خالص کی حدود میں" میں کانٹ نے لکھا ہے کہ ابن اللہ در اصل انسانِ کامل کا آئیڈیل ہے جس کا خارج میں کوئی وجود نہیں ہے، مزید براں وہ تثلیث تجسّم اور کفارّے کو بھی کلیسائی معنوں میں تسلیم نہیں کرتا بلکہ ان تینوں عقیدوں کی تاویل کرتا ہے۔ ہمارے زمانے میں ڈاکٹر رشڈل نے بھی ان عقائد کا انکار کیا ہے، کیونکہ یہ تینوں عقیدے خلافِ عقل ہیں۔

کانٹ کچھ عرصے تک وولف کے فلسفے کا متبع رہ چکا تھا لیکن بعدازاں اُسے اس کے فلسفے پر اعتراضات پیدا ہو گئے، اور وہ لاکؔ کے افکار کی طرف متوجہ ہوا مگر اس فلسفے کی رو سے احساسات کا نظریہ یہ ہے کہ ذہن مختلف خارجی اشیاء کے احساسات کو قبول کرتا رہتا ہے خود کوئی عمل نہیں کرتا۔ لیکن جب تک ذہن میں احساسات کو ایک لڑی میں پرونے کی قوت نہ ہو اس وقت تک ہم صرف غیر مربوط احساسات کے تسلسل کا علم حاصل کر سکتے ہیں حقیقی صداقت تک نہیں پہنچ سکتے۔

لہ بلکہ ہیومؔ کے زیر اثر (وہ خود کہتا ہے کہ مجھے ہیوم نے تحقیق پر مائل کیا۔ ورنہ قبل ازیں میں سو رہا تھا)

چنانچہ کانٹ بڑے غور و فکر کے بعد اس نتیجے پر پہنچا کہ ذہن انسانی بھی علم کے حصول میں عمل کرتا ہے۔ انسان جو معلومات بذریعۂ حواس حاصل کرتا ہے، ذہن ان معلومات کو ترتیب دیتا ہے۔ یعنی ذہن۔ تجربات اور مشاہدات کے خام مواد کو اپنے تیار کردہ سانچے میں ڈھال کر پیش کرتا ہے۔ چنانچہ کانٹ نے کہا کہ زمان اور مکان یہ دونوں خارجی اشیاء کی صفات نہیں ہیں بلکہ ہماری قوتِ احساس کی مختلف صورتیں ہیں، اور فہم کے نام نہاد مقولات در اصل وہ ذہنی اصول ہیں جن کے واسطے سے ہمارے تجارب، علم کی وحدت اور ربط کا درجہ حاصل کرتے ہیں۔

علم کے اس تصوّر سے کانٹ کے فلسفۂ تصوریت کی وہ واضح خصوصیّت ہمارے سامنے آجاتی ہے جس کی بدولت فلسفے ہی میں انقلاب پیدا نہیں ہوا بلکہ علم کا ہر مسئلہ متاثر ہوا ہے۔

لیکن بات یہیں ختم نہیں ہوجاتی یہ تو صرف ہماری محسوس دنیا کا دائرہ ہے جس میں ہم گردش کر رہے ہیں مگر ایک دنیا ورأ المحسوسات بھی تو ہے۔ پس جو باتیں ہمارے حواس کی گرفت سے باہر ہیں ان کا علم ہمیں کس حد تک اور کیسے حاصل ہوسکتا ہے۔

کانٹ کہتا ہے کہ ہمارا ذہن صرف محسوسات سے مربوط اور متعلق ہوسکتا ہے اس لیے ہم صرف مظاہر (PHENOMENA) یا حوادث کا حقیقی علم حاصل کرسکتے ہیں لیکن اشیاء کی حقیقت کا علم ہمیں ہرگز حاصل نہیں ہوسکتا۔ جو کچھ ان مظاہر یا حوادث کے پس پردہ ہے اس کے معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ ہمارے پاس نہیں ہے۔

پس جب ہم کسی محسوس شے کی حقیقت سے آگاہ نہیں ہوسکتے تو نفسِ ناطقہ، عالم وراء المحسوسات اور خدا کے وجود سے کیسے واقف ہوسکتے ہیں؟

لیکن جیسا کہ ہم واضح کرچکے ہیں، کانٹ مذہب سے قطع تعلق کرنا بھی نہیں چاہتا تھا اس لئے اگر "تنقید عقلِ خالص" میں اُس نے خدا اور نفسِ ناطقہ کا انکار کیا تو "تنقید عقلِ عملی" میں اُسنے ان دونوں کا اثبات کردیا یہ کہہ کر کہ اگرچہ ہم اپنی خالص استدلالی عقل کے ذریعے سے خدا کو دریافت نہیں کرسکتے تاہم ہمارا اخلاقی شعور ہمیں اُس تک پہنچا سکتا ہے نیز عقلِ عملی اگرچہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے عقلِ خالص سے مختلف ہے، مگر عقلِ نظری (خالص) سے کمتر یا فروتر نہیں ہے۔

کانٹ کے نزدیک اخلاقی قانون سے متعلق ہمارا شعور، تجارب حسّی کی طرح ایک حقیقتِ نفس الامری ہے۔ نیز وہ ہم پر خارج سے مسلّط نہیں ہوگیا ہے۔ تمام اخلاق کی بنیاد، حریتِ نفس پر ہے جو ہمیں حاصل ہے۔ اس کی بدولت ہم اخلاقی زندگی بسر کرسکتے ہیں۔ اگر انسان کو مجبور تسلیم کرلیا جائے

تو وہ کہہ سکتا ہے کہ میں تو مجبور ہوں اس لیے اخلاقی زندگی بسر نہیں کر سکتا۔

اب اخلاقی زندگی کا نتیجہ راحت یا مسرّت ہے مگر بہت سے انسانوں کو ان کی پاکیزہ اخلاقی زندگی کے مطابق مسرّت حاصل نہیں ہوتی۔ نیز ہماری صلاحیت اور استعداد حصول خیرِ اعلیٰ بھی محدود ہے اس لئے مرنے کے بعد بھی زندگی ہونی چاہیئے تاکہ ہم اخلاقی قوانین کی پابندی کر کے خیرِ اعلیٰ (HIGHEST GOOD) سے بہرہ ور ہو سکیں اور پاکیزہ زندگی کا اجر عطا کرنے کے لیے ایک قادر مطلق ہستی بھی موجود ہونی چاہیئے جو ہر شخص کو اس کے اعمال کی صحیح اور مناسب جزا دے سکے۔

[تفصیل کے لیے دیکھو شرح تنقید عقل خالص از پروفیسر این کے اسمتھ
صـ ۵۷۱ تا صـ ۵۷۹]

کانٹ نے خدا اور بقائے نفس پر جو دلیل دی ہے وہ اگرچہ بظاہر بڑی دل کش نظر آتی ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ خالص علمی سطح پر اربابِ عقل اسے ہرگز تسلیم نہیں کر سکتے۔ اس لئے کہ اوّل تو اخلاقی شعور (MORAL CONSCIOUSNESS) بذاتِ خود ایک اختلافی مسئلہ ہے اور کوئی حتمی اور قطعی دلیل ایسی موجود نہیں ہے جو کسی شخص کو یہ کہنے سے روک دے کہ اخلاقی اصول یا نیکی کے تصورات نہ سرشتِ انسانی میں پیوست ہوتے ہیں، نہ یکساں ہوتے ہیں، نہ ہر شخص ان سے بہرہ ور ہوتا ہے۔ مزید برآں نہ وہ یکساں و عالمگیر ہوتے ہیں اور نہ ہی مطلق اور غیر ممکن التغیر ہوتے ہیں، اور اگرچہ پروفیسر سارلے (SORLEY) نے اپنی تصنیف ——— (MORAL VALUES AND THE IDEA OF GOD) "اخلاقی اقدار اور تصورِ باریؔ" میں اخلاقی اقدار کو مطلق اور مستقل اور جبلّی یا پیدائشی ثابت کرنے کی بڑی کوشش کی ہے لیکن حق یہ ہے کہ اس کی دلیلیں ایک فلسفی کو مطمئن نہیں کر سکتیں۔ اور صرف وہی لوگ جو خدا کو از خود مانتے ہیں وہ بے شک مطمئن ہو سکتے ہیں بلکہ نعرۂ تحسین بھی بلند کر سکتے ہیں۔

ثانیاً کانٹ نے اپنے استدلال کی بنیاد "چاہیئے" رکھی ہے لیکن یہ بنیاد سراسر "پائے چوبیں" کا نقشِ ثانی ہے۔ اس لیے کہ صرف "چاہیے" سے "موجود ہے" یعنی خدا یا نفسِ ناطقہ کی ہستی ثابت نہیں ہو سکتی اور "شاید" یا "باید" اور "ہست" کے درمیان جو خلیج ہے اسے کسی منطق کے ذریعے نہیں پاٹا جا سکتا۔ [1]

[1] ساری عمر صحرائے فلسفہ کی خاک چھاننے کے بعد میں تو اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ جب کوئی فلسفی خدا کا وجود ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے تو انجام کار یا تو وہ شاعری کرنے لگتا ہے یا تصوف کے دامن میں پناہ لے لیتا ہے۔ سچ کہا اکبرؔ الٰہ آبادی نے ہے؎

انکشافِ رازِ ہستی عقل کی حد میں نہیں ؛ فلسفی بیاں کیا کرے اور سارا عالم کیا کرے

کانٹ نے اپنے مذہبی افکار "مذہب در حدود عقل خالص" میں بیان کئے ہیں۔ یہاں کانٹ مسلک (DEISM[1]) کا ترجمان نظر آتا ہے یعنی خدا موجود ہے مگر بندوں سے بے تعلق ہے بالفاظ دیگر کانٹ، وحی اور الہام دونوں کا منکر ہے۔ نیز وہ عیسائیت میں نہ کسی قوت کا معترف ہے نہ کسی روحانیت کا۔ اس کی نگاہ میں عیسائیت بھی "ایجادِ بندہ" ہی ہے کیونکہ عقلاً محال ہے کہ خدا کسی بندے سے ہمکلام ہو۔ اس کے لئے اُسے بھی ایک انسان تسلیم کرنا لازمی ہے۔ کانٹ معجزات کا بھی منکر ہے کیونکہ قوانینِ فطرت میں تبدیلی نہیں ہو سکتی اُس نے اس کتاب میں تجسّم، تثلیث اور کفارے کا بھی انکار کیا ہے۔ مختصر اینکہ یہ کتاب اُن تمام کتابوں کا اصلی ماخذ ہے جو انیسویں صدی میں کلیسائی اور پولوسی عیسائیت کی تردید میں لکھی گئیں۔

اس کتاب میں کانٹ نے سارا زورِ قلم اس نکتے پر صرف کیا ہے کہ ہم اتنا تو جان سکتے ہیں کہ خدا ہے مگر وہ ہے کیا؟ یہ ہم مطلق نہیں جان سکتے[2]

کانٹ کے بعد

کانٹ نے موضوع اور معروض کی ثنویتِ قدیمہ کو بیشک مٹا دیا مگر اس کی جگہ مظہر اور حقیقت (APPEARANCE AND REALITY) کی ثنویت قائم کر دی۔

اس نئی ثنویت کی وجہ سے کانٹ کے تنقیدی فلسفے سے دو رجحانات ظہور پذیر ہوئے۔ ایک تشکیکی میلان جس کا خاتمہ نظریۂ قطعیت (POSITIVISM) پر ہوا۔ اور دوسرا تفکری (SPECULATIVE) میلان، جس نے عقل کی مطلقیت کی حمایت کی اور جس کا کامل ظہور ہیگل کے مدرسۂ فکر کی صورت میں ہوا۔

کانگٹ کانگٹ نے، جو فلسفۂ قطعیت یا اثباتیت (POSITIVISM) کا بانی ہے، کانٹ سے استفادۂ علمی کا اعتراف کیا ہے۔

[اگرچہ بقول ڈاکٹر کیرڈ، اس کی معلومات سطحی تھیں۔ تفصیل کے لیے دیکھو کانگٹ

---

[1] DEISM مسلک انکار وحی مع اعتقاد بوجود اللہ۔

[2] اکبر نے بھی یہی کہا ہے ؎

کیوں خدا کے باب میں بحثوں کی اتنی دھوم ہے
ہست میں شبہ نہیں ہے چیست؟ نامعلوم ہے

کی سوشل فلاسفی مولفہ کیئرڈ (CAIRD)]

لیکن کانگٹ نے بجا طور پر کانٹ پر تناقض کا الزام عائد کیا ہے۔ اور کہا ہے کہ اگر کانٹ اپنے افکار میں موافق (CONSISTENT) ہوتا تو وہ صاف لفظوں میں اعتراف کرتا کہ علم باری غیر ممکن الحصول ہے اور عالم غیر محسوس کا بھی انکار کرتا۔ میری رائے میں جب کانگٹ یہ کہتا ہے کہ " ایک حقیقی وجودِ مطلق یا اصل کائنات کا ہمیں کوئی علم حاصل نہیں ہو سکتا " تو وہ کانٹ ہی کے قول کی تائید کرتا ہے۔ چنانچہ وہ کہتا ہے کہ " انسان کی ذہنی ترقی کا ثبوت یہ ہے کہ وہ یہ اعتراف کرے کہ ہم اُس حقیقت سے آشنا نہیں ہو سکتے جو مظاہر کے پسِ پشت پوشیدہ ہے۔ اسی لئے مابعد الطبیعیات یا فلسفے میں ہم حقیقت اقصیٰ کے بارے میں یقینی طور پر کچھ نہیں کہہ سکتے۔ پس ہمارا صحیح زاویہ نگاہ، لا ادریت ہونا چاہیئے۔ یعنی ہم خدا اور نفس ناطقہ کے بارے میں کوئی قطعی حکم نہیں لگا سکتے۔ یہ اعتراف ہی ہمارے علم کی انتہا ہے " [1]

اسی لئے اس نے خدا کے بجائے انسانیت کو انسان کا معبود بنا دیا۔ وہ کہتا ہے کہ خدا تو ہمارے قیاس، گمان اور وہم سب سے بالاتر ہے۔ ہم نہ اس کا کوئی تخیل کر سکتے ہیں نہ تصوّر [2] اور انسانیت محسوس اور مشہود نہ سہی متصوّر تو ہو سکتی ہے، لہٰذا ہم انسانیت کو اپنا معبود بنا سکتے ہیں یعنی بنی آدم کے احترام اور نوع انسانی کی بہبود کو اپنا مطمحِ نظر بنا سکتے ہیں [3]

---

[1] ہر ایک بات یہ کہتا تھا "من نمی دانم" یہ بات سچ ہے کہ اکبر بڑا ہی عالم تھا

[2] میرا ذاتی مسلک بھی یہی ہے کہ خدا کو محدود قرار دیا جائے تو وہ خدا نہیں رہتا اور لامحدود مانا جائے تو کوئی محدود ذہن کسی لامحدود کا تصوّر نہیں کر سکتا۔ یہ بات محالِ عقلی ہے

ذہن میں جو گھر گیا لا انتہا کیونکر ہوا
جو سمجھ میں آ گیا پھر وہ خدا کیونکر ہوا (اکبر) سلیم چشتی

[3] کانگٹ کے اس نظریئے میں جزوی صداقت تو ہے مگر کامل صداقت نہیں ہے۔ بیشک ہمیں بنی آدم یا آدمیت کا احترام کرنا چاہیئے۔ جیسا کہ اقبالؔ نے بھی مشورہ دیا ہے:

آدمیت احترام آدمی باخبر شو از مقام آدمی

لیکن خدا پر ایمان نہ ہو تو لاکھوں کروڑوں میں بھی ایک آدمی آدمیت کا احترام کرنے کیلئے آمادہ نہ ہو سکے گا۔ اگر مثال درکار ہو تو پاکستان کے تمدنی اور معاشرتی حالات پر ایک نگاہ غلط انداز بھی کافی سے زیادہ ہوگی چونکہ قلوب ایمان باللہ سے خالی ہیں اسلئے آدم اور آدمیت دونوں کا خون پانی سے بھی زیادہ ارزاں ہو گیا ہے۔

سر ولیم ہملٹن

کانٹ کے فلسفے نے لا ادریت کا جو رجحان پیدا کیا اس کو فروغ دینے کا سہرا سر ولیم ہملٹن کے سر ہے جس نے اپنے لیکچروں[1] میں لاادریت کی کافی حمایت کی ہے۔ اس فلسفۂ لا ادریت کو ہیملٹن کے شاگرد رشید ڈاکٹر مینسل (DR. H.S-MANSEL) نے اپنی تصنیف موسومہ "مذہبی فکر کی حدود" (LIMITS OF RELIGIOUS THOUGHT) میں پوری منطقی قابلیت کے ساتھ پیش کیا ہے۔

ہیملٹن نے اپنے مقالے موسومہ "فلسفۂ غیر مقیّد" (THE PHILOSOPHY OF THE UNCONDITIONED) میں اس بات کو واضح کیا ہے کہ اگرچہ خدا بلاشبہ موجود ہے مگر اس کا علم ناممکن ہے اولاً اس لیے کہ ہمارا ذہن محسوسات سے بالاتر ہو کر کسی حقیقت کا ادراک نہیں کر سکتا ثانیاً اس لیے کہ الوہیت کی شان اس بات سے ارفع ہے کہ وہ کسی انسانی ذہن کی گرفت میں آسکے اور کوئی محدود ہستی، اس کی کنہ کو دریافت کر سکے۔ [2]

ڈین مینسل

ڈین مینسل (۱۸۷۱ - ۱۸۲۰) نے بھی یہی طرز استدلال اختیار کیا اور کہا کہ ہماری قوت مدرکہ میں یہ صلاحیت ہی نہیں ہے کہ وہ کسی لامتناہی کا ادراک کر سکے۔ نیز انسانی عقل کے لیے کسی غیر محدود ہستی کا تصور ہی محال ہے۔

ہکسلے، مِل اور سپنسر

ہکسلے، مِل اور سپنسر[3] نے اپنے فلسفۂ لا ادریت یا ارتیابیت

---

[1] ہیملٹن کے لیکچروں کا مجموعہ اڈنبرا سے چار جلدوں میں شائع ہوا تھا جس کا عنوان ہے "منطق اور مابعد الطبیعات پر ہیملٹن کے لیکچر" ان کے مطالعے سے یہ بات عیاں ہو سکتی ہے کہ ہیملٹن نے کانٹ سے اثر قبول کیا تھا۔ یہ لیکچر میں نے ۱۹۲۶ء میں پڑھے تھے جو مجھے لاہور کے ایک کباڑی سے صرف دو پیسے میں مل گئے تھے۔

[2] تواں در بلاغت سخن را رسید نہ در کنہ بے چون سبحاں رسید (سعدی)

[3] ان تینوں حکما کی تصانیف کی بدولت انگلستان میں انکار و الحاد کے فلسفے کو بہت فروغ حاصل ہوا۔ انیسویں صدی کے آخر میں ان حکما کے خیالات ہندوستان میں آئے اور تعلیم یافتہ ہندو اور مسلمان اُن سے متاثر ہوئے۔ اکبر الٰہ آبادی نے ان تینوں حکما پر تنقید کی ہے:

۱- نہ پڑھ تو قرآں کا وعظ بھائی خوشی سے تقلید ہکسلے کر ؛ پھرے گا کمپو میں آخر اک دن دیا سلائی کا بکس لے کر

۲- کتاب دل مجھے کافی ہے اکبر درس حکمت کو ؛ میں اسپنسر سے مستغنی ہوں مجھ سے مِل نہیں ملتا

۳- غزالی و رومی کی بھلا کون سنے گا ؛ غُل میں چھڑا نغمۂ اسپنسر و مِل ہے۔

کا قصر ہیملٹن اور مینسل ہی کے افکار کی بنیاد پر تعمیر کیا۔ چنانچہ اسپنسر لکھتا ہے کہ اعلیٰ ترین مذہبی صداقت جس کا ہمیں سب سے زیادہ یقین ہے، یہ ہے کہ وہ قوت جس کا اظہار یہ کائنات کر رہی ہے، کلیتہً ناقابلِ فہم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسپنسر نے مذہب کو "ایک مجہول قوت کے خوف سے مرعوب ہو کر، اس کے سامنے سر جھکانے سے تعبیر کیا ہے"۔ ——— (جاری)

بقیہ: تفسیر - صفحہ ۳۲ سے آگے

ہے۔ یعنی ان کے چہرے اپنی کامیابیوں پر ہشاش بشاش ہوں گے اور ہر قدم پر ان کے ساتھ اعزاز و تکریم کا معاملہ ہو رہا ہو گا۔

'جزاء سیئة بمثلها وترهقهم ذلة مالهم من الله من عاصم' یہ بروں کا انجام بیان ہوا ہے، کہ برائی کا بدلہ پورے انصاف کے ساتھ بالکل ہموزن ہو گا، ان کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں ہو گی۔ 'وترهقهم ذلة' میں 'ذلت' کے ساتھ 'قتر' کا ذکر نہیں کیا۔ اس کی تفصیل 'كانما اغشیت وجوههم قطعا من الليل مظلما' کی تشبیہ میں آگئی اور اس سے یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ 'قتر' سے مراد مایوسی کی سیاہی ہے اور چونکہ یہ ابدی مایوسی کی سیاہی ہو گی اس وجہ سے ایسا معلوم ہو گا کہ گویا ان کے چہروں پر شبِ تاریک کے ٹکڑے کاٹ کاٹ کر ڈال دیئے گئے ہیں۔ 'مالهم من الله من عاصم' سلسلۂ کلام کے بیچ میں جملہ معترضہ کے محل میں ہے۔ یعنی ابدی مایوسی اور ذلت سے ان کو وہاں چھڑانے والا کوئی نہیں ہو گا۔ دنیا میں جن معبودوں سے سفارش اور مدد کی امیدیں باندھ کر ان کی پرستش کی ہو گی وہ سب ہوا ہو جائیں گے، ان میں سے کوئی کام آنے والا نہ بنے گا۔

بقیہ: عطر فتنہ: (صفحہ ۶۰ سے آگے)

ے پریوں کے عاشقوں کو سودا ہوا مسوں کا! ‏ ‏ جو پھاڑتے تھے جامہ اب کوٹ سی رہے ہیں

نظیر شریف تھے جامہ پھاڑتے تھے، مسٹر کوٹ اور پتلون کی کریز اور ٹائی کی "ناٹ" دیکھتے ہیں۔ مجبوری ہے۔ ماڈرن نظیر کو مسٹر ہی بننا پڑتا، لہذا وارفتہ مزاجی کا تقاضا بھی شاید اتنا صحیح نہ ہو —— آپنے حضرت اکبر کا یہ شعر تو سنا ہی ہو گا۔

ے جو سُن چکے میری غزلیں تو بوسے لا چندہ ‏ ‏ جو ہنہنایا ہے اتنا تو تھوڑی بید بھی کر

اس نفاست سے کبھی کبھی حضرت مسٹر بھی کر اکبر کے مریدمیں کام لے لیتے ہیں، انکی آخری غزل کا آخری سے پہلا شعر ہے

ے تجھ سے جو کچھ ملے غنیمت ہے ‏ ‏ تیرا زانو نہیں تو لات سہی!

اگر اکبر وہ کچھ کہہ سکتے ہیں تو مسٹر یہ کچھ کیوں نہیں کہہ سکتے۔ مگر خیال رہے کہ کتاب مزاحیہ ہے۔

● تالیف
ڈاکٹر سٹین وڈ قاب
سابق پروفیسر رابرٹ کالج، استنبول، ترکیہ

عربی تہذیب کے زیرِ اثر یورپ میں سائنسی نقطۂ نظر کی ترویج و ترقّی

ترجمہ:
پروفیسر اعجاز احمد چودھری - استاد ہاشمی میموریل کالج آف کامرس لاہور

علمی تحقیق، سائنسی اختراع و ایجاد اور تکنیکی تغیّرات کے ساتھ ساتھ مغرب میں "مسیحیت" نے بھی ترقی کی۔ لیکن اس حقیقت کی تاریخی شہادت موجود ہے کہ تاریخ عالم کے ایک اہم موڑ پر سائنسی فکر و نظر اور سائنسی تحقیقات کی "عیسائیت" سے زیادہ اسلام نے حوصلہ افزائی کی۔

سائنس کے متعلق آغاز سے ہی مسیحیت کا رویّہ معاندانہ و مخاصمانہ تھا۔ رومی سلطنت کے ابتدائی دور میں "کلیسیا" عملی طور پر یونانی رومی (GRACEO- ROMAN) ثقافت سے بالکل الگ تھلگ رہا۔ اس لاتعلقی اور علیحدگی پسندی کی وجہ سے متعصّب کلیسیا نے اس یونانی رومی ثقافت کے علمبرداروں کی "تعذیب" (PERSECUTION) کی ضرورت محسوس نہ کی۔ وہ تو اپنے عالم نزع میں دم توڑ رہی تھی۔ اس لیے بھی کلیسیا نے درگذر سے کام لیا۔ لیکن بعد میں شمالی یورپ کے قوطی قبائل کی پے درپے یلغاروں نے اس یونانی رومی ثقافت کے ٹمٹماتے چراغ کو گل کر کے اس کو مکمل طور پر تباہ و برباد کر دیا۔ کچھ عرصہ کے بعد جیسے ہی کلیسیا کی مشرقی مسیحی سلطنت کو دوبارہ عروج نصیب ہوا تو متعصّب اور کٹّر مسیحیوں نے ملحدانہ و کافرانہ نظریات کے حامل فلاسفروں اور سائنسدانوں کو ذلیل و رسوا کرنا شروع کر دیا۔ ان کو ہلاک تک کر دیا جاتا تھا حتیٰ کہ ایتھنز (ATHENS) کا دارالاساتذہ لائی سیئم (LYCEUM)

مقفل کر دیا گیا۔ انہوں نے فلسفۂ یونان کے دوسرے اہم مرکز سکندریہ کو بھی بالکل تباہ کر دیا تھا۔

صدیوں تک عربی اور یونا رومی سائنس کے وارثین یورپ میں بڑی محتاط خاموشی کے ساتھ اور خفیہ طریقوں سے اپنے علمی و سائنسی کام سرانجام دیتے رہے۔ کیمسٹری کے سائنسدان جو اس وقت محض کیمیا گر سمجھے جاتے تھے۔ اپنے فنی نتائج کو ایک قسم کے خفیہ رموز میں مدوّن کرتے تھے۔ یہ رواج کافی مدت تک جاری رہا حتیٰ کہ پندرھویں صدی شمسی کے اواخر تک لیونارڈو ونسی (LEONARDO DA VINCI) اپنی بیاض کو ناقابلِ فہم مرموز رسم الخط میں تحریر کرتا رہا۔

لیکن کلیسا کی زبردست بالادستیوں اور پابندیوں کے باوجود یورپ میں زندگی کا ایک جدید رجحان منصۂ شہود پر آنے لگا۔ ایک مخصوص خمیر کی خفیہ کارگزاری جاری تھی اور یہی خمیر قرونِ وسطیٰ کے یورپ میں اپنی بارآوری ثابت کرنے کے لیے بالکل مستعد تھا۔ اور اسی نے یورپی زندگی کو ایک نیا نقطۂ نظر عطا کیا۔ حقیقتاً یہی سائنسی نقطۂ نظر تھا۔

(۲)

۱۴۹۲ شمسی تاریخ عالم میں ایک خاص اہمیت کا حامل تھا۔ اسی سال اسلامی غرناطہ اپنے زوال کے آخری اور فیصلہ کن مرحلے میں داخل ہوا اور اسلامی ثقافت کا انحطاط بھی کلی ہونے لگا۔ اس لیے ساتھ ہی یورپ میں سائنسی فکر و نظر کی لہر بھی اٹھی جس کے مقدر میں تھا کہ وہ جلد ہی سائنسی جدیدیت کی ایک موج بلاخیز بن جائے۔ اسی سال امریکہ کی نئی دنیا بھی دریافت ہوئی۔

دراصل اندلس میں عربوں اور یہودیوں کے اخراج کے ساتھ ہی اسلامی سائنس اور اسلامی ثقافت کا خاتمہ ہو گیا تھا۔ ان اندلسی عربی مہاجرین نے مراکش میں اندلسی اسلامی ثقافت سے ٹمٹماتے چراغ کی لو کو روشن کیے رکھا۔ لیکن حوادثِ زمانہ کی تند و تیز موجوں نے اس خفیف سی روشنی کو مدہم سے مدہم تر کر دیا جو بالآخر بجھ ہی گئی کیونکہ مراکش (مراکو) میں پناہ گزینی کے بعد اندلسی عربوں کو ثقافتی جمود و اضمحلال، نیز [illegible] کسل مندی نے ناکارہ کر دیا۔ اس عبوری دور میں ایک طرف مراکش کے اندلسی عرب ثقافتی انحطاط کا شکار تھے تو دوسری طرف بحیرہ روم کے پرلے کنارے ثقافتِ اسلامیہ کو نیم مہذب ترکی قبائل سے سخت خطرہ لاحق تھا۔ یہ یورش پسند ترکمان غیر مہذب و غیر شائستہ جنگجو تھے جو سارے مشرقِ وسطیٰ کے اسلامی ممالک کو اپنی تاخت و تاراج کا نشانہ بنا رہے تھے یہ صورت ویسی ہی تھی جیسی قوطی قبائل کی پیدا کردہ صورتحال نے یورپ کی یونا رومی ثقافت کو تباہ و برباد کر دیا تھا۔

اس پُر آشوب دور میں اسلامی دنیا کو ایک مخصوص حلقۂ شفق نے گھیر رکھا تھا (یعنی اس کے افق پر نہ تو قرونِ مظلمہ کے یورپ کی بے علمی اور افلاس کا گھٹا ٹوپ اندھیرا چھایا ہوا تھا اور نہ ہی سائنسی و علمی سوُج کی ضیاء باریوں اور جلا بخشیوں سے اسلامی دنیا منوّر ہو کر فیض رساں ہو رہی تھی) مسلمانوں کا ستارۂ عروج و اقبال غروب ہو چکا تھا لیکن مسیحی دنیا اقبال مندی کے زینوں پر چڑھنے لگی تھی۔

(۳)

تاریخ کے اس مقام سے یورپ نے اپنی ثقافتی ترقی کو ان بے مثال بلندیوں اور رفعتوں کی طرف مائل پرواز کیا جو کلاسیکی یونا رومی دور میں ناقابلِ تصوّر تھیں۔ ایک عظیم الشان تہذیب کی تشکیل و تعمیر کے لیے سب سے ناگزیر لازمہ دولت و سرمایہ تھا جو یورپ کو اسلامی دنیا پہ فتح کے ساتھ ہی میسر آ گیا۔ یورپ اور انگلستان کے اہم شہری مراکز، صنعت و حرفت اور تجارت کے باعث جلد ہی خوشحال ہو گئے۔ امراء، رؤسا، سرمایہ کار اور تجّار دیکھتے ہی دیکھتے مالدار ہو گئے۔ میکسیکو اور پیرو کے دو امریکی شہروں نے اپنے سونے اور چاندی سے سارے یورپ کو دولت مند بنا دیا۔ غرضیکہ یورپ میں دولت کی فراوانی ہونے لگی۔ کالج اور سکول قائم ہونے لگے۔ اُن کو بیش بہا عطیے ملنے لگے۔ تعلیم کی دل کھول کر حوصلہ افزائی کی جانے لگی۔۔۔

سارے یورپ میں ایک خاص جوش و ولولہ بیدار ہوا جس کا شاندار نتیجہ یہ نکلا کہ یورپی فضا کے ذرے ذرے سے کامیابی و کامرانی کی خوشبو اور مہک آنے لگی۔ یورپی ممالک کی حدود یورپ تک ہی محدود نہ رہیں۔ امریکہ کی وسیع و عریض "نئی دنیا" ان کے قدموں کے نیچے تھی۔ جس پہ جلد ہی یورپی اقوام نے فاتحانہ یورش کر کے آبادکاری کا لامتناہی سلسلہ شروع کر دیا۔ چاروں، فریقی سواحل کا چپہ چپہ چھان مارا گیا، راس امید کے راستے اہلِ یورپ نے ایشیا کی سرزمین پہ بھی قدم جمانے شروع کر دیئے بلکہ حقیقت یہ تھی کہ راس امید کے بحری راستے ہی کی بدولت اہلِ مغرب نے فلپائن، انڈونیشیا اور ہندوستان کے عظیم ممالک کو فتح کر لیا تھا۔

عربوں نے سات صدیاں پہلے مختلف ممالک کی فتوحات کے نتیجے میں اسلامی سلطنت کے انتظام و انصرام کی خاطر جن اوصافِ شخصیّہ و خصائلِ کردار کا زبردست ہنگامہ خیز اور پُرجوش عملی مظاہرہ اور تجربہ کیا تھا۔ اس تاریخی مرحلے پہ یورپینوں کا طرزِ عمل عربوں کے مذکورہ ولولہ انگیز تجربہ سے اچھی خاصی مماثلت رکھتا تھا۔ یورپینوں میں بھی اولعزم قسمت آزمائی، کارہائے نمایاں کے لیے مستعد آمادگی اور مہم جوئی کے لیے تند و تیز ہیجان اور پُرجوش ولولہ پایا جاتا تھا۔ عربوں نے بھی اسی جذبِ دروں کی بدولت

مفتوحہ اسلامی سلطنت کی تنظیم کی اور ترقی دی تھی۔ اسلامی سلطنت کی طرح مذہبی وحدت۔ اور ثقافتی یکانگت نے سارے یورپ کو متحد کر دیا۔ اس عظیم الشان متحدہ یورپ کی علمی زبان لاطینی تھی جس کی وجہ سے مختلف النسل اور مختلف اللسان یورپی علماء و فضلاء بھی متحدہ و موافق ہو گئے۔

اس عظیم الشان ملکی، ثقافتی، مذہبی اور لسانی اتحاد کے باوجود یورپ مجیر العقول اور ہیئت ارضی کو تبدیل و منقلب کر دینے والی سائنسی اختراعات و ایجادات کو منصۂ شہود پر لانے کے ناقابل تھا۔ ایسی انقلاب آفرین سائنسی ترقی کی راہ میں ابھی ایک زبردست رکاوٹ موجود تھی۔ یہ رکاوٹ یورپ کی رائج الوقت مدرسیت (SCHOLASTICISM) تھی۔ یورپ کے علمی مکاتب مسیحیت کی منطقی تاویلوں میں مصروف رہتے تھے اور علمی بحث و مناظرہ کا بازار گرم رہتا تھا جس سے سائنسی ترقی میں رکاوٹ پیدا ہونے لگی۔ اس مسیحی مدرسی علم الکلام نے عیسائیت کی منطقی تشریح و توضیح میں قوم کے بہت سے قیمتی وقت اور ذہن کو ضائع کر دیا۔ اس نیم مذہبی مباحث میں مجرد خیالات و تصورات کی موشگافیوں میں زیادہ لطف و کیف حاصل کیا جاتا۔ بجائے اس کے کہ یہی فکری و نظری توانائی حقیقی دنیا کے مسائل حل کرنے میں استعمال کی جاتی۔ بلکہ اس فلسفہ کے نام نہاد حاملین عقیدتاً روحانی رفعت و سرفرازی کی جستجو میں ارضی رذائل کو پائے حقارت سے ٹھکرا دیتے۔ یہ نیم مذہبی فلسفہ دراصل افلاطونی نظریات سے مماثلت رکھتا تھا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ صدیوں تک رومن کیتھولک مسیحی عوام کی عقل و فکر تامس اکوئنس (THOMAS AQUINAS) اور ڈنس سکاٹس (DUNS SCOTUS) کے متکلمانہ نظام عقائد کی آہنی زنجیروں سے جکڑی رہی۔

یونانی مدبر و سیاست دان پریکلز (PERICLES) کے عہد میں یونانی عقل و فکر نے خوب ترقی کی تھی اس کے بعد صدیوں تک اس یونانی حکمت پر کئی قسم کی حدود و قیود عائد رہیں اور یہی قیود یونانی سائنس کی ترقی میں مزاحمت بنی رہیں۔ کلیسیا نے بھی سائنسی عقل و فکر کی مخالفت میں پورا علم الکلام گھڑ کے رکھ دیا لیکن تعقل پسندی کی مذکورہ مساعدت نے اس کا رخ عملی مقاصد کی طرف پھیر دیا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جزوی طور پر دونوں عاملین مزاحمت یعنی کلیسائی فکر و نظر اور یونانی حکمت کی باہمی مخالفت ہی عہد مابعد کی یورپی سائنسی ترقی کا سبب بن گئی۔

یونانیوں نے فلسفیانہ حکمت و دانش کی جستجو کے لیے تحقیق کی۔ دور دراز کے سفر اختیار کیے اپنے علمی مشاہدات اور قلبی واردات کی شیرازہ بندی کی۔ لیکن یونانیوں نے سائنس کے معروضی تجربات کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ اُن کا ذہن منطق استقرائی (INDUCTIVE LOGIC) کی طرف راجع بھی نہیں ہوا۔ صرف ارشمیدس جیسا یونانی سائنٹسٹ ان محدود مستثنیات میں سے ایک تھا۔

اس پُر آشوب دور میں اسلامی دنیا کو ایک مخصوص حلقۂ شفق نے گھیر رکھا تھا (یعنی اس کے افق پر نہ تو قرونِ مظلمہ کے یورپ کی بے علمی اور افلاس کا گھٹا ٹوپ اندھیرا چھایا ہوا تھا اور نہ ہی سائنسی و علمی سوچ کی ضیاء باریوں اور جلا بخشیوں سے اسلامی دنیا منوّر ہو کر فیض رساں ہو رہی تھی) مسلمانوں کا ستارۂ عروج و اقبال غروب ہو چکا تھا لیکن مسیحی دنیا اقبال مندی کے زینوں پر چڑھنے لگی تھی۔

(۳)

تاریخ کے اس مقام سے یورپ نے اپنی ثقافتی ترقی کو ان بے مثال بلندیوں اور رفعتوں کی طرف مائل پرواز کیا جو کلاسیکی یونا رومی دور میں ناقابلِ تصوّر تھیں۔ ایک عظیم الشان تہذیب کی تشکیل و تعمیر کے لیے سب سے ناگزیر لازمہ دولت و سرمایہ تھا جو یورپ کو اسلامی دنیا پر فتح کے ساتھ ہی میسر آ گیا۔ یورپ اور انگلستان کے اہم شہری مراکز، صنعت و حرفت اور تجارت کے باعث جلد ہی خوشحال ہو گئے۔ امراء، روٴسا، سرمایہ کار اور تجّار دیکھتے ہی دیکھتے مالدار ہو گئے۔ میکسیکو اور پیرو کے دو امریکی شہروں نے اپنے سونے اور چاندی سے سارے یورپ کو دولت مند بنا دیا۔ غرضیکہ یورپ میں دولت کی فراوانی ہونے لگی۔ کالج اور سکول قائم ہونے لگے۔ اُن کو بیش بہا عطیے ملنے لگے۔ تعلیم کی دل کھول کر حوصلہ افزائی کی جانے لگی۔

سارے یورپ میں ایک خاص جوش و ولولہ بیدار ہوا جس کا شاندار نتیجہ یہ نکلا کہ یورپی فضا کے ذرّے ذرّے سے کامیابی و کامرانی کی خوشبو اور مہک آنے لگی۔ یورپی ممالک کی حدود یورپ تک ہی محدود نہ رہیں۔ امریکہ کی وسیع و عریض "نئی دنیا" ان کے قدموں کے نیچے تھی۔ جس پر جلد ہی یورپی اقوام نے فاتحانہ یورش کر کے آباد کاری کا لامتناہی سلسلہ شروع کر دیا۔ چاروں، فریقی سواحل کا چپہ چپہ چھان مارا گیا، راس امید کے راستے اہلِ یورپ نے ایشیا کی سرزمین پر بھی قدم جمانے شروع کر دیئے بلکہ حقیقت یہ تھی کہ راس امید کے بحری راستے ہی کی بدولت اہلِ مغرب نے فلپائن، انڈونیشیا اور ہندوستان کے عظیم ممالک کو فتح کر لیا تھا۔

عربوں نے سات صدیاں پہلے مختلف ممالک کی فتوحات کے نتیجے میں اسلامی سلطنت کے انتظام و انصرام کی خاطر جن اوصافِ شخصیّہ و خصائلِ کردار کا زبردست ہنگامہ خیز اور پُر جوش عملی مظاہرہ اور تجربہ کیا تھا۔ اس تاریخی مرحلے پر یورپینوں کا طرزِ عمل عربوں کے مذکورہ ولولہ انگیز تجربہ سے اچھی خاصی مماثلت رکھتا تھا۔ یورپینوں میں بھی اولوالعزم قسمت آزمائی، کارہائے نمایاں کے لیے مستعد آمادگی اور مہم جوئی کے لیے تند و تیز ہیجان اور پُر جوش و ولولہ پایا جاتا تھا۔ عربوں نے بھی اسی جذبِ دروں کی بدولت

مفتوحہ اسلامی سلطنت کی تنظیم کی اور ترقی دی تھی۔ اسلامی سلطنت کی طرح مذہبی وحدت۔ اور ثقافتی یگانگت نے سارے یورپ کو متحد کر دیا۔ اس عظیم الشان متحدہ یورپ کی علمی زبان لاطینی تھی جس کی وجہ سے مختلف الاصل اور مختلف النسل یورپی علماء و فضلاء بھی متحدہ و موافق ہو گئے۔

اس عظیم الشان ملکی، ثقافتی، مذہبی اور لسانی اتحاد کے باوجود یورپ محیر العقول اور ہیئت ارضی کو تبدیل و منقلب کر دینے والی سائنسی اختراعات و ایجادات کو منصۂ شہود پر لانے کے ناقابل تھا۔ ایسی انقلاب آفرین سائنسی ترقی کی راہ میں ابھی ایک زبردست رکاوٹ موجود تھی۔ یہ رکاوٹ یورپ کی رائج الوقت مدرسیت (SCHOLASTICISM) تھی۔ یورپ کے علمی مکاتب مسیحیت کی منطقی تاویل میں مصروف رہتے تھے اور علمی بحث و مناظرہ کا بازار گرم رہتا تھا جس سے سائنسی ترقی میں رکاوٹ پیدا ہونے لگی۔ اس مسیحی مدرسی علم الکلام نے عیسائیت کی منطقی تشریح و توضیح میں قوم کے بہت سے قیمتی وقت اور ذہن کو ضائع کر دیا۔ اس نیم مذہبی مباحث میں مجرد خیالات و تصورات کی موشگافیوں میں زیادہ لطف و کیف حاصل کیا جاتا۔ بجائے اس کے کہ یہی فکری و نظری توانائی حقیقی دنیا کے مسائل حل کرنے میں استعمال کی جاتی۔ بلکہ اس فلسفہ کے نام نہاد حاملین عقیدتاً روحانی رفعت و سرفرازی کی جستجو میں ارضی رذائل کو پائے حقارت سے ٹھکرا دیتے۔ یہ نیم مذہبی فلسفہ دراصل افلاطونی نظریات سے مماثلت رکھتا تھا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ صدیوں تک رومن کیتھولک مسیحی عوام کی عقل و فکر ٹامس اکوئینس (THOMAS AQUINAS) اور ڈنس سکاٹس (DUNS SCOTUS) کے متکلمانہ نظامِ عقائد کی آہنی زنجیروں سے جکڑی رہی۔

یونانی مدبر و سیاست دان پریکلز (PERICLES) کے عہد میں یونانی عقل و فکر نے خوب ترقی کی تھی اس کے بعد صدیوں تک اس یونانی حکمت پر کئی قسم کی حدود و قیود عائد رہیں اور یہی قیود یونانی سائنس کی ترقی میں مزاحمت بنی رہیں۔ کلیسا نے بھی سائنسی عقل و فکر کی مخالفت میں پورا علم الکلام گھڑ کے رکھ دیا لیکن تعقل پسندی کی مذکورہ مدافعت نے اس کا رخ عملی مقاصد کی طرف پھیر دیا چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جزوی طور پر دونوں عاملین مزاحمت یعنی کلیسائی فکر و نظر اور یونانی حکمت کی باہمی مخالفت ہی عہدِ مابعد کی یورپی سائنسی ترقی کا سبب بن گئی۔

یونانیوں نے فلسفیانہ حکمت و دانش کی جستجو کے لیے تحقیق کی۔ دور دراز کے سفر اختیار کیے اپنے علمی مشاہدات اور قلبی واردات کی شیرازہ بندی کی۔ لیکن یونانیوں نے سائنس کے معروضی تجربات کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ اُن کا ذہن منطق استقرائی (INDUCTIVE LOGIC) کی طرف راجع ہی نہیں ہوا۔ صرف ارشمیدس جیسا یونانی سائنس دان محدود مستثنیات میں سے ایک تھا۔

مشہور مدبر و سیاست دان پیری کلیز (PERICLES) کے عہد عروج سے قبل یونان میں سائنسی فکر و نظر رائج تھا لیکن اس کے بعد سارے یونان کی علمی دنیا میں منطق استخراجی (DEDUCTIVE LOGIC) نے زبردست زور پکڑا کہ سائنسی فکر صدیوں تک اس حملہ سے جانبر نہ ہو سکی۔ پیری کلیز (PERICLES) کے بعد کا طویل تاریخی عہد سائنسی ایجاد و اختراع اور تحقیق و تفتیش سے تہی دامن رہا۔

افلاطون کے نزدیک، سائنسی تحقیق مطالعۂ داخلیت، یعنی غیر معروضی دنیا- (SUBJECTIVE-WORLD) پر فلسفیانہ غور و فکر کا نام تھا۔ دوسرے الفاظ میں سائنسی تحقیق فہم علت اولیٰ یا علت العلل (ULTIMATE CAUSE) کی فکری کوششیں کہلاتی تھیں۔ علمائے طبیعیات کے مشاہداتی اعمال کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہوئے افلاطون نے فلکیاتی ماہرین پر بھرپور طنز کی تھی۔ افلاطون لکھتا ہے کہ "آسمان پر احمقانہ انداز میں ٹکٹکی لگائے رکھنا یا نیم وا آنکھوں سے زمین پر نظر جمائے رکھنا دراصل دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے ایک ہیئت دان کسی ذی حس مدرک (SENSIBLE ——— OBJECT) کا مطالعہ جس قدر عمق سے چاہے کرتا رہے لیکن میرا گمان اغلب یہی ہے کہ اس مطالعہ سے کبھی بھی وہ علمی معلومات حاصل نہیں کر سکتا۔ کیونکہ عالم محسوسات کسی سائنسی تدبر و عمل کا متحمل نہیں ہو سکتا۔"

مارٹن لوتھر نے شمالی اور جنوبی غیر متجانس یورپ میں اپنی اصلاحی تعلیمات کا ایک پیوند لگایا جس سے سولہویں صدی میں کی یورپی تحریک اصلاحِ کلیسیا ظہور پذیر ہوئی۔ اس تحریکِ اصلاح کی بدولت سارے یورپ میں شعبۂ تعلیم (مدرسی) "ہیئت" کی فکری جکڑ بندیوں سے آزاد ہوگیا۔ اس طرح تعلیم لادینی یا غیر مذہبی (SECULAR) ہوگئی۔ پروٹسٹنٹی مسیحیت نے سائنسی تحقیقات کو پوری آزادی بخشی اس کے برعکس کیتھولک اصحاب کا رویّہ مخالفانہ ہی رہا۔ ان دونوں مسیحی فرقوں کی مسابقت میں بالآخر مؤخرالذکر نے سائنسی فکر و نظر سے مصالحت کر لی۔

مسیحی کلیسا نے سائنسی تحقیق و تفتیش پر جو قدغن لگا رکھی تھی آہستہ آہستہ ختم ہوتی گئی۔ کارپرنیکس کا نظریہ حرکتِ ارضی مدتوں یورپ کے کلیسیائی پاپاؤں کے عتاب کا سبب بنا رہا۔ "کلیسیائی عدالت ہائے احتساب" (INQUISITIONS) نے تو اس نظریے کے حامیین کو تختۂ دار پر لٹکانے میں بھی کوئی تامل نہیں کیا۔ (مشہور اطالوی راہب، مسیحی مدرسیت کے زبردست نقاد، ہمہ اوست کے مبلّغ، سرفلپ سڈنی کے مصاحب اور کوپرنیکس کے حامی) برونو (BRUNO) کو زندہ نذر آتش کر کے کلیسا نے سائنس کا گلا گھونٹنے کی آخری مگر کامیاب کوشش کی۔ گیلیلیو (GALILEO) کے ساتھ بھی اس متعصب

غیر سائنسی ذہن نے یہی سلوک روا رکھا۔ اہل کلیسیا نے گیلیلیو کو تختۂ دار پر تو نہیں لٹکایا لیکن اس کو اپنے آبائی گھر واقع اطالوی ریاست فلورنس (FLORENCE) میں مقیّد کر دیا۔ جہاں اس کے "کافرانہ و ملحدانہ" نظریات کے پیش نظر یہ سزا تجویز کی گئی کہ وہ انجیل مقدس کی دعائیں اور مناجات تلاوت کیا کرے۔

(۴)

مسلمانوں نے کلاسیکی دنیا کے گنج ہائے علم و حکمت کو غرق ہونے سے بچا لیا، پھر ان کی توسیع و ترقی کے لیے بیش بہا خدمات انجام دیں۔ سترھویں صدی کے آغاز میں جملہ اسلامی سائنسی علوم اور عملی فنون کا بیش بہا خزانہ یورپ کے قبضے میں جا چکا تھا۔ اب تاریخ کے اس اہم دور کا آغاز ہوتا ہے جس میں یورپی سائنس و تہذیب نے بتدریج نہایت برق رفتاری سے منازل ترقی طے کرنا شروع کر دی تھیں۔

جدید سائنسی دور کا افتتاح گیلیلیو (GALILEO، ۱۵۶۴ تا ۱۶۴۲ شمسی) کے سائنسی نظریات سے ہوتا ہے۔ اس اطالوی سائنسدان سے پہلے ہالینڈ میں دوربین اپنی بے ڈھنگی اور نامکمل شکل میں ایجاد ہو چکی تھی لیکن گیلیلیو نے اس کی تکمیل کر دی۔ گیلیلیو نے ہی کوپرنیکس کے نظریۂ گردشِ ارضی کی صحت کو پایہ ثبوت تک پہنچا دیا۔ اس نے اجسام افتاں (FALLING BODIES) کی حرکت کے سلسلے میں اہم تجربات کئے۔ ان تجربات کے باعث یہ اطالوی حکیم قانون ثقل کی دریافت کے بالکل قریب پہنچ گیا تھا۔ بعد میں انہی تحقیقاتی تجربات سے نیوٹن نے بہت استفادہ کیا۔ میکانیکات میں بھی گلیلیو نے کئی اضافے کئے۔ اس نے ماضی کے منتشر نظریات اور تجربات کو یکجا جمع کر کے قوت (FORCE) کو بطور میکانکی عامل (AGENT) کے تسلیم کیا۔ علم الحرکیات (DYNAMICS) پر اس کی قیاس آرائیاں اور کئی مسائل حرکیہ کے حل نے بعد کی دخانی قوت (STEAM POWER) کی ایجاد کو ممکن بنا دیا۔ یاد رہے کہ اسی قوت کے استعمال سے جدید سائنسی دور کا آغاز ہوتا ہے۔

دراصل گیلیلیو ہی جدید مغربی سائنسدانوں کا بابا آدم ہے۔ اس نے EXPEIMENT — تجربہ اور ریاضیاتی حسابیت — MATHEMATICAL CALCULATION) کی باہمی آمیزش سے نتائج اخذ کرنے کا طریقہ اختیار کیا۔ اس طریقہ عمل نے جدید قوت و توانائی کے دور کی طرف راہنمائی کی۔

(۵)

جس سائنسی دور کا آغاز گیلیلیو نے کیا تھا۔ اس نے سترھویں صدی میں زبردست ترقی

کی۔ ۱۶۱۱ شمسی میں کیپلر (جرمن ہیئت دان) نے پہلی مکمل دوربین تیار کی۔ اُس نے نظام شمسی کے ارضی اور دوسرے کرّوں کے قوانین مدارِ بیضویہ (LAWS OF ELLIPTICAL ORBITS) کے انکشاف کا اعلان کیا۔ اسی نے قمری اثراتِ مدوجزر کا ادراک کیا اور پھر کششِ ثقل کے متعلق بھی کئی حقائق دریافت کئے۔

علم الادویہ کے شعبہ میں بھی کئی نمایاں ترقیاں ہونے لگیں۔ ویزالیئس (VESALIUS) اور سروی ٹس (SERVITUS) کے ابتدائی تجربات پر انحصار کرتے ہوئے ولیم ہاروے نے پہلی دفعہ نظریہ دورانِ خون شائع کیا۔

۱۶۲۰ شمسی میں فرانسس بیکن (FRANCIS BACON) نے لاطینی زبان میں مشہور رسالہ بعنوان "نئے آلات" (NEW INSTRUMENTS IE NOVUM ORGANUM) شائع کیا۔ فرانسس بیکن وہ برطانوی عالم ہے جس نے سائنس کے موضوع پر یورپ کی سب سے آخری لاطینی تصنیف پیش کی تھی (اس میں سائنسی تحقیق کے لیے نئے طریقوں اور حربوں کا ذکر تھا) اس نادر علمی نسخے کا انتساب انسانی فلاح وبہبود کے نام ہے۔ اس تصنیف نے ہی سائنسی ترقی کے لیے یورپ کو پہلی دفعہ تجربی اور استقرائی (INDUCTIVE) طریقِ تحقیق سے روشناس کرایا۔ اس کتاب کا عظیم الشان اثر یہ ہوا کہ یورپ کے قرونِ وسطیٰ کے استخراجی (یعنی تصوراتی وعینی) طریقۂ تجزیہ کو یکسر ختم کر دیا گیا۔ بیکن وہ پہلا برطانوی مفکر ہے جس نے ایک سائنسدان کے لیے یہ اخلاقی ضابطہ بھی مقرر کیا کہ اس کو جملہ تعصّبات وظنّیات اور فاسد خیالات سے بالاتر ہو کر خالص سائنسی تحقیق میں مصروف رہنا چاہیئے۔

بیکن نے سائنس کی عمرانی قدروقیمت کے پیشِ نظر اس کو انسانی فلاح کا عظیم ترین ذریعہ قرار دیا۔ وہ لکھتا ہے کہ "سائنس کا صحیح اور پاکیزہ مقصد صرف یہی ہو سکتا ہے کہ انسانی زندگی کو قدرت کی نئی قوتوں اور مختلف ایجادات و اختراعات سے مالا مال کر دیا جائے۔" اس طرح اس عظیم برطانوی فلاسفر نے کمال پیش بینی اور عاقبت اندیشی سے سائنس کے جدید تکنیکی پہلو کی نقش کشی کی ہے

دار الاشاعت الاسلامیہ اور ماہنامہ میثاق لاہور کے
کراچی میں
سول ایجنٹ بیسرز شفیق پریس
کچہری روڈ، کراچی۔ فون: ۲۳۵۲۳۵

مرزا محمد منور

مسٹر دہلوی

اور ان کے "مزاحیہ، طنزیہ اور فکریہ کلام" کا مجموعہ

عطرِ فتنہ

سال ۷۲ء راقم الحروف کی زندگی میں اس اعتبار سے یادگار رہے گا کہ اس کے دوران راقم نے صرف ایک ماہ کے ناغے کے سوا ہر ماہ کراچی کا چکر لگایا۔ اور ایک ناغے کی تلافی بھی انشاء اللہ العزیز اسطرح ہو جائیگی کہ اواخر دسمبر میں پورے آٹھ روز "قرآنی تربیت گاہ" کے سلسلے میں کراچی میں قیام رہے گا (از ۲۳ تا ۳۰ دسمبر ۷۲ء)۔ سفر جہاں موجب کوفت و کلفت ہے وہاں یقیناً کاشفِ عجائب و غرائب بھی ہے۔ چنانچہ راقم کو بھی ان اسفار سے دوسری بہت سی نئی معلومات (اور انکشافات) کے ساتھ محترم مشتاق احمد صاحب چاندنا المتخلص بہ "مسٹر دہلوی" کے پیکر میں ایک جامع تضادات شخصیت اور "مظہر العجائب والغرائب" انسان سے ملنے کا موقع ہاتھ آیا ——— ذہانت اور شوخی تو جڑواں بہنیں ہیں ہی جو ایک جدید فتوے کی رو سے بیک وقت ایک ہی شخص کے نکاح میں رہ سکتی ہیں۔ چنانچہ ایک طرف تو یہ دونوں حضرتِ مسٹر کی باندیاں ہیں اور دوسری طرف دل کے درد اور احساس کے کرب سے بھی انہیں حصّۂ وافر عطا ہوا ہے۔ اسی طرح ایک طرف وضع قطع کے اعتبار سے وہ صحیح معنی میں "مسٹر" ہیں تو دوسری طرف نہ صرف پابند صوم و صلوٰۃ ہیں بلکہ ذاکر و شاغل بھی! ——— گزشتہ "اسفارِ عشرہ" کے دوران راقم حضرتِ مسٹر کی ملاقات ہی سے شاد کام نہیں ہوا بلکہ متعدد بار انکا کلام خود ان ہی کی زبان سے سننے کا اتفاق ہوا جس سے معلوم ہوا کہ حسنِ معنیٰ اور حسنِ کلام پر اگر حسنِ ادا اور حسنِ صوت کا اضافہ بھی ہو جائے تو بات کہاں سے کہاں جا پہنچتی ہے ——— جہاں تک مسٹر کے کلام کا تعلق ہے راقم اسی شش و پنج میں رہا کہ اسے "قندِ تلخ" کہا جائے یا "تلخابہ شیریں"۔ کبھی خیال آتا کہ یہ "الحقُّ مُرٌّ" کے مصداق "حقائقِ تلخ" ہیں اور کبھی خیال ہوتا کہ اس کے لیے "صداقتِ عریاں" کا عنوان موزوں تر ہے۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ کبھی کبھی تو محسوس ہوتا کہ یہ عریانی اس قدر متجاوز عن الحد ہو گئی ہے کہ اب آنکھیں بند کئے بغیر چارہ نہیں! ——— ایک بار تو جناب مسٹر سے انکا کلام سنتے ہوئے یوں بھی محسوس ہوا جیسے اکبر اور نظیر، دونوں کی روحیں پیکرِ مسٹر میں حلول کر گئی ہوں۔ چنانچہ مجلس میں موجود احباب کے سامنے ریاضی کا یہ فارمولا بھی راقم نے پیش کیا کہ مسٹر = $\frac{\text{اکبر + نظیر}}{2}$ ——— اس بات کا ذکر یہاں بر سبیل تذکرہ سمجھئے کہ راقم نے مسٹر کے دسترخوان پر بھی تلخی و شیرینی کا باہمی شدید آہنگ و امتزاج موجود پایا ——— قارئین تصدیق کریں! راقم نے انکی ضیافت طبع کیلئے کبھی کچھ "روٹیاں" حضرتِ مسٹر سے غالباً اپریل ۷۲ء ہی میں حاصل کر لی تھیں لیکن پھر یہ خیال مانع ہوتا رہا کہ میثاق کے مجموعی مزاج میں یہ چیز کچھ کھپتی نظر نہ آئی۔ اب جو مسٹر کا مجموعہ کلام چھپا اور وہ ایک تو راقم کی وساطت سے اور دوسرے ایک اور ذریعہ سے محترم مرزا منور صاحب تک پہنچا اور انہوں نے ایک مفصل مقالہ اسی "مزاحیہ، طنزیہ اور فکریہ" رنگ میں سپردِ قلم کر دیا۔ تب راقم کو خیال آیا کہ اس تبصرے کے ساتھ اگر نمونے کی "روٹیاں" بھی شائع ہو جائیں تو کوئی حرج نہیں چنانچہ

ﮯ دونوں ہدیۂ ناظرین ہیں۔ (اسرار احمد)

بڑے آدمیوں کا تخلص جب آنجہانی ہوجاتا ہے تو ان کے باب میں بہت کچھ کہا جانے لگتا ہے۔ اور تو اور اس امر کا ذکر بھی ہوکے رہتا ہے کہ فلاں آنجہانی کبیر نے وقتاً فوقتاً کس کس کتاب کو شوق کی نظر سے مشرف فرمایا۔ مجھے خطرہ محسوس ہو رہا ہے کہ میری آج کی تحریر آئندہ چل کر کسی ریسرچ سکالر کے ساتھ ساز باز کرے گی اور اسے اس نتیجے پر بآسانی پہنچا دے گی کہ میں نے "عطر فتنہ" کو پسندیدگی کی نظر سے مفتخر لیا۔ اطلاعاً عرض ہے کہ مفتخر کا حسب نسب فخر اور افتخار سے ملتا ہے۔ مفت اور خرسے نہیں۔ ہاں مگر کوئی ریسرچ سکالر میرے حوالے یا میری نسبت سے کسی کتاب کی ٹوہ جھبی لگائے گا کہ خدا نخواستہ میں بڑا آدمی بن جاؤں۔ تو بھائی پریشان نہ ہوں کسی آدمی کا کچھ پتہ نہیں ہوتا کہ وہ کب اچانک بڑا بن بیٹھے یا بنا کے بٹھا دیا جائے اور پھر وہ ایسا بیٹھے کہ اٹھنے کا نام نہ لے۔

سرورق پر "عطر فتنہ" کا جو نقشہ دیا ہوا ہے وہ خاصہ خیال انگیز ہے۔ دس اشیاء دی ہوئی ہیں جن کا "عطر" نکالا جا رہا ہے۔ وہ دس اشیاء یہ ہیں:۔ جاہ پسندی، صوبائیت، خود پرستی، آرام طلبی، غلامانہ ذہنیت تلون، خوشامد، زر پرستی، رشوت، تضاد ——— اسے عربی میں کہیں گے "تِلْکَ عَشَرَۃٌ کَامِلَۃٌ" ——— ہمارے معاشرے میں دس کا نمبر ویسے بھی معتبر ہے چہ جائیکہ اس کا بھی عطریات لیکن یہ نقشہ بہت نمایاں ہے۔ نقشہ تو میں کہہ رہا ہوں، کوئی نازک مزاج قاری صاحب نقشہ کے بجائے نقش کہنا چاہیں تو انہیں اجازت ہے۔ چونکہ یہ نقشہ بہت نمایاں ہے لہٰذا اندیشہ یہ ہے کہ کتاب کا نام رہ جائے گا اور مسٹر دہلوی غائب ہوجائیں گے۔ مشہور کتابوں کے مصنفین میں سے اکثر کے اسم کے باب میں یہی رسم رہی ہے مثلاً لکھا گیا۔ "صاحب الاغانی کا بیان ہے کہ ...." "صاحب الفہرست نے بیان کیا ہے کہ "... یعنی کتاب کی شہرت اپنے مصنف کے نام کی شہرت کو پیچھے چھوڑ گئی۔ یہ تصور بڑا اندوہناک ہے مگر ہوگا یہی کہ مسٹر دہلوی لوگوں کے ذہن سے محو ہوجائیں گے اور کہا جائے گا تو یہ کہ "صاحب عطر فتنہ کا وہ شعر جس میں ...." عربی میں کتاب کی ایسی نسبت سے "صاحب" کا معنی مصنف ٹھہرتا ہے، مگر چونکہ اسلامی جمہوریۂ پاکستان میں عربی کے علاماؤں کی بھرمار بلکہ مارا مار ہے۔ اس لیے یہاں "صاحب" کا معنی کلمۂ اعزاز سے زیادہ کچھ نہ ہوگا۔ جیسے ہم کہتے ہیں "فلاں دہلوی صاحب"۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ "صاحب عطر فتنہ" کا مطلب گا، عطر فتنہ صاحب ——— گویا مسٹر دہلوی کا نام پڑھ جائے گا "عطر فتنہ صاحب"۔ دیکھئے تو سہی مجھے خواہ مخواہ کیا کیا اندوہ لاحق ہیں۔ بقول غالب

~ محو تفطیر عطر فتنہ جناب
میں اور اندیشہ ہائے دور و دراز:

اور ہاں وہ دس اشیاء مزاجاً بے شک مختلف ہوں مگر کتاب کے سرورق پر ایک ہی صورت میں جلوہ گر ہیں۔ مثلاً اگر مرزا غالب انہیں دیکھیں تو دس آم قرار دیں۔ الف لیلٰے باتصویر پڑھنے والے پہچان لیں گے کہ یہ اشرفیوں

کی دس تھیلیاں ہیں اور وہ اہلِ بزم جو "شمع کے ہوا خواہ" ہیں "وہ زبانہ شمع" بتائیں گے گویا

؎ اک عطر نما ورق میں بہت سے بناؤ ہیں

مگر یہ ترکیب پذیر اشیا دس ہی کیوں ہیں؟ نو یا نو دو گیارہ کیوں نہیں؟ مگر ہاں دورِ اعشاری آنے والا ہے اور آنے والے دور کی صورت عارفوں کی نگاہوں پر بے حجاب ہوتی ہے ——— پھر اگر آپ طائے عطر کے عصا کو بوتل ہی جانیں جس کے سر پر قیف سج رہا ہے تو یہ لفظ عطر فتنہ کے بجائے عصر فتنہ پڑھا جائے گا، اور حق یہ ہے کہ میں نے عصر فتنہ ہی پڑھا تھا۔ اور دس اشیاء کے نچوڑ کو عصر کی ایک تعبیری نسبت سے خود ہی عصارہ بھی بنا لیا تھا۔ مزید برآں یہ کہ عطر فتنہ کی نقش گری پر رنگ سرخ حاوی ہے، زمین نیلی ہے۔ اس سرخ اور نیلے رنگ سے بوقت ضرورت فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے وہ یوں کہ نیلی زمین کو نیلا آسمان بتایا جا سکتا ہے، رہی سرخی تو اسے حسب ضرورت خونِ شہدا کی لالی بھی قرار دیا جا سکتا ہے اور سرخ سحر بھی، اس طرح گنجائش ہے کہ بقول اکبر الہ آبادی:

؎ شیخ بھی خوش رہے شیطان بھی ناراض نہ ہو

سرورق کے اندر کا صفحہ اس عنوان کا مالک ہے۔ "ولی را ولی می شناسد" مگر سرورق کے دوسرے پرت کے باہر کی طرف اعلان ہے۔ "عطرِ فتنہ کے بارے میں نامور عطاروں کی رائے" اور اندر کی طرف ہے "عطرِ فتنہ ماہرینِ خوشبویات کی نظر میں" ——— میں حیران ہوں کہ حضرتِ مسٹر نے یہ کیا فتنہ آرائی فرمائی ہے یعنی اہلِ قلم کے ایک حزب کو "اولیا" بنا دیا ہے، اور ایک فرقے کو عطار قرار دیا ہے اور ایک فریق کو ایک طرح سے عطر شناس بتایا ہے۔ اس طرح اہلِ قلم کی برادری کو تین میں تقسیم کر دیا ہے حالانکہ یہ ایک اور تین کے الٹ پھیر کا مسئلہ نہیں۔ اب کون پوچھے کہ حضرت اگر ڈاکٹر محمود حسین ولی ہیں تو ڈاکٹر اشتیاق حسین کیوں محض ماہر خوشبویات ٹھہرے، اگر مشتاق یوسفی اور ابن انشا ولی ہیں تو مشفق خواجہ اور برگیڈیر صدیق سالک کا کیا قصور؟ ہم اس امتیازی سلوک کے خلاف احتجاج کرتے ہیں۔ حد ہے صاحب! کہ ایک گروہ کو اولیا بنا دیا جائے اور دوسرے کو "بوید و بگوید" کی گردان کے سپرد کر دیا جائے۔

یہی کچھ نہیں۔ ایک فتنہ اور بھی ہے اور وہ قابلِ غور بھی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ نامور عطاروں کو "ماہر خوشبویات" تسلیم نہیں کیا گیا ورنہ یہ دو مختلف عنوان کیوں؟ گویا حفیظ جالندھری، جوش ملیح آبادی اور فیض احمد فیض فقط نامور عطار ہیں، انہیں عطر کے اچھا برا ہونے یا ایک عطر کے دوسرے سے مختلف الاثر اور مختلف الموسم ہونے کا کچھ پتہ نہیں۔ گویا یہ جانتے ہی نہیں کہ حنا کیا ہے اور خس کیا۔ اس مفہوم کی سلیس تر تشریح یہ ہوئی کہ اس قطار یا صف والے لوگ شاعر تو ہیں مگر شعور شعر نہیں رکھتے۔ دیکھا آپ نے کہ حضرت مسٹر نے کس

سادگی و پرکاری ہے اہلِ قلم برادری کو اہلِ علم (عین۔ لام مفتوح) برادری بنا کے فرق و امتیاز پیدا کر دی ہے۔

ع　آپ آگے نہ بڑھے ساقی و مینا سے کبھی
ہم فقط دور نظر پیرِ مغاں دیکھیں گے

اب ان سارے اہلِ صفوف کو دیکھئے (اگر خدا نخواستہ کاتب از رہِ اصلاح صفوف کے "ن" کو "س" میں بدل دے تو گناہ اس کی گردن پر) اور حضرت مسٹر سے پوچھئے کہ اگر آپ نے تقسیم و تفرقہ پر کمر باندھی تھی تو پھر یہ کیا ستم کیا کہ حفیظ جالندھری اور فیض احمد فیض، ماہر القادری اور جوش ملیح آبادی، نعیم صدیقی اور شورش علیگ کو ایک ہی صف میں کھڑا کر دیا ہے۔ یہ ایک دوسرے کے محمود و ایاز ہرگز نہیں ہوتے یا تو کوئی عنوان نہ ہوتا یا یہ زیرِ عنوان بے عنوانی یقیناً زیادتی ہے ________ علاوہ ازیں جو آدمی بیک وقت رشید احمد صدیقی و نعیم صدیقی اور محمد جعفری و ضمیر جعفری کا دوست ہو، جو معاً شوکت سبزواری سے بھی یاری رکھتا ہو اور زیڈ اے بخاری سے بھی، جو حکیم محمد سعید سے بھی رابطہ رکھتا ہو اور ممتاز حسین سے بھی۔ حفیظ سے بھی اور جوش سے بھی، اس شخص کے بارے میں آپ کیا رائے قائم کریں گے، ظاہر ہے آپ اسے وسیع المشرب شخص قرار دیں گے۔ کیا وسیع المشرب بعض اوقات وہ نہیں ہوتا جس کا کوئی مشرب نہ ہو؟ مگر ایسی بات بھی نہیں۔ حضرت مسٹر کا کلام بتاتا ہے کہ آپ بڑے باحمیت مسلمان ہیں۔ پھر یہ آخر چکر کیا ہے؟ اور ہاں ستم بالائے ستم یہ کہ ہم تک یہ کتاب دو بالکل متضاد بلکہ متناقض طریق سے پہنچی، ایک نسخہ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے دیا اور دوسرا جناب شیخ عبداللہ ورنے بہم پہنچایا، ڈاکٹر صاحب اس عالمِ محسوسات میں "ایمان بالغیب" کے مدرس ہیں اور حضرت شیخ جہانِ محجوبات کے بارے میں "قربان بالغیب" کے معلم۔

یہ کچھ تو تھا کتاب کے خارجی احوال کا مجمل سا بیان، اب داخلی ظروف پہ نگاہ اٹھتی ہے، مگر ساتھ ہی محسوس ہونے لگتا ہے کہ جناب خدا رفتہ صاحب فرما رہے ہیں

ع　تو برون در چہ کردی کہ درون خانہ آئی

کتاب کا پہلا ورق الٹتے ہی مصنف کی تصویر دکھائی دیتی ہے۔ تصویر کے نیچے یہ اشعار ثبت ہیں

ع　منہ میں انگلش سے زباں تن پہ ہیں کپڑے انگلش　　ہم میں اسلاف کی اب بات ہی بھائی کیا ہے
مسٹرانہ ہوئی جب فکر و نظر ہی اپنی　　ہو تخلص بھی جو مسٹر تو برائی کیا ہے

میں نہیں جانتا کہ حضرت مسٹر کی عمر کیا ہے، یہ بھی نہیں جانتا کہ یہ تصویر ۱۹۷۲ء میں لی گئی یا ۱۹۴۲ء میں۔ تصویر ہمیشہ فریب کار رہی ہے، مصر کے شہزادے محمود کوئی تصویر دیکھ کر چین کی طرف روانہ ہو جایا کرتے تھے

بڑھاپے میں جوانی کی تصویریں عموماً تشہیر پذیر دیکھی ہیں مگر ایسے اہلِ ہمت کم ہی دیکھے جو کسی مصوّر سے کہیں کہ ہماری حالی جوانی میں تیس سالہ جمع کرکے بڑی صورت تصویریں اب اس کی تصویر بنا دو تاکہ اسے مجموعۂ کلام، ناول یا ڈرامے کے ساتھ وابستہ کر دیا جائے۔ دلچسپ یہ ہے کہ قلمکار حضرات اپنی کاوشوں کے ساتھ اپنا ماضی وابستہ کرتے ہیں نہ کہ مستقبل میری طرح آپ کو بھی یہ تجربہ حاصل ہوگا کہ خود اپنی تصویر کو چھوڑ کر بالعموم تصویریں اصل صورتوں سے زیادہ خوبصورت ہوتی ہیں۔ یہی باعث ہے کہ تصویر زدہ کو کہنا پڑتا ہے

دیکھ کر کیا گئے تیرے در پہ!
دیکھ کر کیا پھرے ترے در سے

واضح ہے کہ تصویر دیکھ کر گئے اور صورت دیکھی تو اپنا سا منہ لے کر لوٹ آئے، مگر بحوم اولادِ آدم میں اکّا دکّا وہ بھی تو نکل آتے ہیں جو اپنی خوبصورت ترین تصویر سے بھی کہیں زیادہ خوبصورت ہوتے ہیں چنانچہ ان کے معاملے میں بھی تصویر معتبر نہیں۔ بس تصویر کا مصرف ایک طرح کی شناخت سی رہ جاتی ہے۔ لہٰذا اہلِ نظر کو اس سے کیا کام، خفیہ پولیس والے، پاسپورٹ بنانے اور چیک کرنے والے جانیں۔ تاہم راقم الحروف حضرت مسٹر دہلوی کی حوصلہ افزائی کی خاطر عرض کرتا ہے کہ ان کی تصویر اچھی خاصی ہے۔ اگر کبھی صورت دیکھی تو پھر دیکھا جائے گا، کیا پتہ ان کی تصویر ان کی صورت سے اتنی ہی دور ہو جتنی مشتاق یوسفی صاحب کی شخصیت ان کی تحریر سے ———— بات یہ ہے کہ "زرِ گزشت" پڑھ چکا تھا۔ غالب بدہن کی زیارت ابھی نصیب نہ ہوئی تھی کہ لاہور کے کسی ہوٹل کی ایک شگفتہ محفل میں ایک صاحب نہایت مقطع لہجے میں خاموش بیٹھے نظر آئے۔ صورت سے کورستانی کے مفرور دکھائی دیتے تھے جی چاہا کہ پوچھوں "حضرت آپ فی البدیہہ یہاں پہنچ گئے؟ ———— لیکن جب تعارف ہوا تو سخت دلشکنی ہوئی، پتہ چلا کہ آنجناب مشتاق یوسفی ہیں۔ یقین نہ آیا۔ جب ذرا بولے تو مان لیا۔ ؎

تا مرد سخن نہ گفتہ باشد!
خواہ یوسفی ہو نہفتہ باشد!

"عطرِ فتنہ" کے اجزائے ترکیبی میں ایک جزو تضاد ہے، وہ تضاد صاحبِ عطرِ فتنہ کی تصویر اور تحریر کے باب میں بھی قدم قدم پر جلوے دکھاتا ہے۔ یعنی تصویر خالص مسٹرانہ مگر کتاب کے محتویات کی روح دیندارانہ اور بعض اوقات مولویانہ، کتاب کا آغاز اللہ اور اللہ کے رسول ؐ کے ذکر سے ہو رہا ہے۔ یعنی پہلا قطعہ ہے خداپرستی اور دوسرا قطعہ ہے عشقِ نبیؐ۔ دونوں قطعوں کے آگے سوالیہ نشان ہے، پوچھنا یہ مقصود کہ کیا ہم واقعی خدا پرست ہیں اور کیا ہم واقعی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے عشق کرتے ہیں؟ ۔ مسٹر فرماتے ہیں کہ ہماری خداپرستی کا مطلب یہ ہے کہ عمل سے غافل ہو کر بیٹھ رہیں اور اپنی ہر ناکامی کا ذمہ دار مشیّت الٰہی کو ٹھہرائیں۔ اگر خدا نہ ہوتا

تو یہ ذمہ داری براہِ راست ہم پر آن پڑتی ۔ اس اعتبار سے خدا ہم ناکاروں کی ایک نفسیاتی ضرورت ہے

میں ان ناکامیوں کا کس کو ذمہ دار ٹھہراتا
نہ ہوتا گر خدا تو مجھ پہ ہر الزام آجاتا!

اور عشقِ نبیؐ میں عاشقانِ رسولؐ کے اخلاص کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے ۔

ہماری جان بھی حضرت پہ قربان — خدا ماں باپ بھی آن پہ ہمارے
عمل بھی کرتے ان کے حکم پہ ہم — مگر فیشن نہیں اب اس کا پیارے!

گویا فیشن اس عشق سے عزیز تر اور لذیذ تر ہے ——— حضرت اکبر نے کہا تھا

انکار نہیں نماز و روزہ سے مجھے — لیکن یہ طریق اب ہے فیشن کے خلاف

اس قطعے کے بعد نعتِ رسولِ مقبولؐ ہے ، جس کا آخری شعر ہے

نہ آنے پائے کوئی حرف مسترؔ — تمہارا دین ہے آنِ محمدؐ

بتانا یہ مقصود تھا کہ وہ کتاب جس میں تکھن ، آئینہ ، فیملی پلاننگ ، بیویاں بتوہرنامہ اور بونے ڈنر اور ماڈرن بنجارہ نامہ ایسی شوخ اور ظریفانہ و مسترانہ نظمیں شامل ہیں، اس کتاب کا آغاز اتنا متین اور مومنانہ ہے

آدمی واقعی عجیب مخلوق ہے ۔ نہایت ناقابلِ اعتماد ۔

یہاں ایک دعا لب پہ آتی ہے ۔ اگر میری دعا کے ساتھ ساتھ آپ کو رحم کا دورہ پڑے تو ضرور آمین ارشاد فرمائیے وہ دعا یہ ہے کہ خدا عاشق کو مدرّس اور مزاح نگار کو محقق نہ بنائے ۔ اس فریاد کا فوری محرّک وہ تحقیقی مقالہ ہے جو حضرت مسترؔ نے مزاح کی علم پر قلمبند فرمایا ہے ، مقالہ بڑی محنت سے لکھا گیا ہے اور میرے جیسے ان پڑھ لوگوں کے نزدیک " محنت " کی علامت یہ ہوتی ہے کہ مقالے میں حوالے بہت ہوں ۔ خواہ ان کی کثرتِ تعبیر کے باعث مفہوم معنیٰ اللہ کے حوالے ہو جائے ۔ آپ حضرات پھول سے تعارف کراتے ہیں مگر پتی پتی اور بیج کا دانہ دانہ جدا کر کے ، وہ تعارف تو اجزا کا ہوا ، پھول تو آپ نے غائب کر دیا ، اجزاء کی تالیف آپ کے بس میں نہیں ۔ بہر حال مسترؔ دہلوی نے مزاح کی نفسیات اور مالہٗ اور ماعلیہ پہ روشنی ڈالی ہے ، مزا آتا اگر یہ ساری باتیں ایسی ہی شگفتگی سے کہی جاتیں جیسی شگفتگی کے اشعار حامل ہیں ، حضرت اکبر الٰہ آبادی بھی نثر شگفتہ نہیں لکھتے تھے اور جناب مسترؔ پر حضرت اکبر کا اثر تو نمایاں ہے ہی ۔ مجھے اس کتاب میں اس مقالے کی موجودگی یوں محسوس ہوتی ہے جیسے کسی سیک بر رقاصہ کو جو کسی ماہر طبلہ نواز کی انگلیوں کی طرح متحرک ہو لوہے کی انگیا پہنا دی جائے ۔

رہی اُن کی ظریفانہ شاعری تو سبحان اللہ ، میں چونکہ مشاعرہ باز شاعر نہیں ہوں لہٰذا میری داد اُس شعبے سے متعلق نہیں جسے " شعبۂ تبادلۂ منافقت " کہتے ہیں ۔ عطرِ فتنہ پر طائرانہ سی نظر ڈالنے سے بھی واضح

ہو جاتا ہے کہ جناب مسٹر نے حضرت اکبر الہ آبادی اور میاں نظیر اکبر آبادی سے نمایاں اثر قبول کیا ہے۔ دین سے لگاؤ اندھی تقلید اور یورپی اقدار سے نفرت اور اسلامی اسلوب حیات سے وابستگی وغیرہ اُن کا رشتہ اکبر سے جوڑ دیتی ہے جاہ و مال و منال اور دنیاداری کے ہر کھٹراگ کی فناپذیری کا احساس شدید انہیں نظیر اکبر آبادی کے مریدوں میں شامل کر دیتا ہے۔ اکبرؔ اور نظیرؔ مل کر اچھا قوام بن گئے اس پر بیسویں صدی کے نصف کے پُر جوش، تیز، اور ہوس پرست ماحول کی "لاحول" سے پیکانڈ کے اثرات کی چھاپ کا اضافہ کیجئے۔ چنانچہ مسٹر کی ہلکی پھلکی، صحت مند، سبق آموز، شگفتہ اور فرحت بخش شاعری وجود میں آگئی، اس شاعری میں نہ تو نظیر اکبر آبادی کے "آدھی رات" کے مضمون ہیں اور نہ وہ قنوطیت جو اکبرؔ الہ آبادی کی ظرافت کے برقعے میں محجوب ہے اور وہ کہہ اٹھتے ہیں

شعر اکبر کو سمجھو یادگار انقلاب :
یہ اسے معلوم ہے ٹلتی نہیں آئی ہوئی !!

اتفاق دیکھئے کہ میں نے "عطر فتنہ" کو اس لئے کھولا ہے کہ نشان زدہ اشعار کو نمونے کے طور پہ درج کروں اور حضرت مسٹر کو داد ظرافت دوں تو پہلی نظم جو سامنے آئی ہے وہ "فیملی پلاننگ" ہے۔ حضرت اکبر نے فرمایا تھا

شرع کی رُو سے جو شادی پہ نظر کرتا ہوں
جلوۂ کثرتِ اولاد نظر آتا ہے !!

اس شعر سے بے شرع کی شادی کی ترغیب ہوتی ہے مگر ضبطِ تولید کی نہیں کہ اس کے مقابل مسٹر فرماتے ہیں

اے مرے لختِ جگر، نورِ نظر، جانِ پدر
پیدا ہونے کی تجھے کیسے اجازت دے دوں ؟

ہے یہاں علم گراں، ساتھ ہی خوراک گراں — پھل گراں دودھ گراں اور ہے پوشاک گراں
ہیں مکانات گراں، وہ کہ خطرناک گراں ! — انتہا یہ کہ یہاں ہیں خس و خاشاک گراں
پرورش آجکل اولاد کی مہنگی ہے پسر !
پیدا ہونے کی تجھے کیسے اجازت دے دوں !

قرآن میں تو ارشاد باری تعالےٰ ہے کہ 'لا تقتلوا اولادکم خشیۃ املاق' مگر ہم کہتے ہیں 'اقتلوا اولادکم ......' ۔ ظاہر ہے کہ جس مقام پر باپ بیٹے ہیں یہ معاملہ ہو رہا ہے، ہاں اگر "ضبط" عمل میں آتا ہے تو وہ قتل ہے، لہذا کہنا چاہیئے

اے مرے لخت جگر، نور نظر، جان پدر
قتل کر دوں میں تجھے، تیری اجازت ہو اگر (یہ دوسرا مصرع راقم الحروف کا ہے)

گھر میں عنقریب وارد ہونے والے مہمان عزیز کا راستہ روکنا مشکل کام تھا مگر حضرت مسٹر نے حملہ مدافعتی مجبوریوں کا ایک ایک کرکے واسطہ دیا ہے کہ بیٹا ہمارے معاشرے پر تو پہلے ہی وقت پڑ رہا ہے لہٰذا اگر ممکن ہو تو ٹل جاؤ۔

ہاں تو حضرات قارئین ایک چیز سے آپ بخوبی آگاہ ہیں لغواً بھی اور اصطلاحاً بھی، یعنی مکھن —— —— جو آجکل لغواً نادر ہے لہٰذا معدوم کے حکم میں آتا ہے اصطلاحاً وافر بلکہ بافراط ہے، مطلب یہ ہے کہ آجکل مکھن کھایا نہیں جاتا فقط لگایا جاتا ہے اور دیدہ دلیری سے لگایا جاتا ہے، اکثر لگوانے والے کی فرمائش کی تعمیل میں اور بعض اوقات لگانے والے کی ضرورت کی تکمیل میں۔ لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو ہر آدمی دونوں کام کرتا ہے۔ اس لیے کہ ہر آدمی بیک وقت ظالم بھی ہے اور مظلوم بھی، خوشامدی بھی اور خوشامد طلب بھی، بے غیرت بھی اور غیرت کش بھی، مگر یہ مزدوری بیشتر بڑے سلیقے سے عمل میں آتی ہے مکھن اس سلیقے سے لگایا جاتا ہے کہ سبحان اللہ اور اس انداز سے لگوایا جاتا ہے کہ ماشاء اللہ، بالفاظ دیگر بڑے فنکارانہ اسلوب میں احمق بنا جاتا ہے اور احمق بنایا جاتا ہے —— علامہ اقبال نے فرمایا تھا ع "غیرت ہے بڑی چیز جہان تگ و دو میں"۔ مگر ضرورت نے تصرف کرایا اس لئے کہ اب غیرت کی جگہ مکھن کی ضرورت ہے۔ اور مکھن سے بہتر غیرت کا جانشین اور ہو بھی کون سکتا ہے۔ ع رفت غیرت بجایش مکھن ماند

چنانچہ حضرت مسٹر نے بیان کیا ہے

ہر شخص بڑوں کو تو یہ دے چھوٹوں سے مانگے ۔۔۔ چھوٹا اسے اپنے سے بھی چھوٹے بھیّوں سے مانگے
افسر یہ منسٹر کو دے، ماتحتوں سے مانگے ۔۔۔ ماتحت اسے زوجہ سے اور بچوں سے مانگے

ہے لطف کہ مکھن کا طلبگار ہے مکھن
مکھن ہے عجب چیز جہان تگ و دو میں

مکھن تو حماقت کی سزا ہے ہی سراسر! ۔۔۔ ملتا ہے مگر اہل خرد ہی کو یہ اکثر!!
یا ٹیچر ہو بڑا سیٹھ کوئی یا کوئی افسر! ۔۔۔ لوگ اس کو لگاتے ہیں کنستر کے کنستر!!

ممدوح جو بھولے ہیں تو عیّار ہے مکھن!
مکھن ہے عجب چیز جہان تگ و دو میں!!

اس کتاب میں ایک نظم بڑی خطرناک ہے۔ اس کا عنوان 'بیویاں' ہے۔ اگر بیویوں کی مدح میں ہوتی تو ہرگز خطرناک نہ ٹھہرتی۔ مگر یہ تو بالعکس ہے۔ کنوارے احباب میری اس تشویش کی صحیح تشخیص نہ کرسکیں گے مگر مزدوج حضرات بلا استثنیٰ جانتے ہیں کہ بندہ کیا عرض کر رہا ہے —— اتنی جرأت بلکہ جسارت کے مضامین دیکھ کر پوچھنا پڑتا ہے آیا جناب مسٹر شادی شدہ ہیں؟ ورنہ ہر شریف اور خصوصاً مسٹر، جیسا کہ وہ تصویر میں جلوہ گر ہیں بیویوں کے

حلقوں میں بڑے برخوردار قرار پاتے ہیں اور ان کا مجموعی لقب " غلام زوجہ خان " ہوتا ہے۔ فرض کیا کوئی غلام زوجہ خان نہ بھی ہو تو جب بھی بیوی کے اقتدار اعلیٰ پر تعریض وہ حرکت نہیں جو غیر مشروط طور پر قبول کی جا سکے۔ اوّل تو گھر ہی میں اونچا سانس لینا بہت بڑی ہستی ہے چہ جائیکہ اپنے نغمۂ شادی کو خاوندوں کا اجتماعی " نوحۂ غم " بنا دیا جائے، پھر اس پہ بھی بس نہ کیا جائے بلکہ اس نوحۂ غم کو پریس کے سپرد کر کے دنیا بھر میں چالو کر دیا جائے۔ لیکن اس نظم سے بالکل قریب ہی ایک اور نظم نظر پڑی۔ اس کا عنوان ہے " شوہرنامہ " جس کے زیر عنوان بین القوسین مندرج ہے " ہماری اور آپ کی کہانی۔ ہماری، آپ کی بیویوں کی زبانی "

آپ میں سے جو کہنہ مشق خاوند ہیں اور قدیم الخدمت ہونے کے باعث نسبتاً زیادہ عیار اور مبتلائے بیگم فریب واقع ہوئے ہیں وہ میری طرح یہ سمجھنے پر مجبور ہوں گے کہ حضرت مسٹر نے پہلے " شوہرنامہ " قلمبند فرمایا اور اقتدار اعلیٰ کی زبان میں اپنی برادری کو خوب خوب کوسا اور اس طرح سرکار کی خوشنودی حاصل کر لی۔ پھر اس خوشنودیٔ سرکار کا فائدہ اٹھایا اور بڑی دردمندی کے ساتھ یہ مصرع گایا۔

" کرم ہائے تو مارا کرد گستاخ "

اس کے بعد بامید عفو و درگزر نظم " بیویاں " قلمبند کر دی، کچھ بھی ہو دونوں خوب ہیں، آپ کو معلوم ہے جب آدم اور حوّا سے جنّت میں اللہ کے کسی حکم کے باب میں ذرا غفلت عمل میں آگئی تھی تو اللہ نے انہیں جنت سے نکال دیا تھا البتہ وہاں صیغہ تثنیہ کا نہیں رہا، صیغہ جمع کا ہے، ارشاد ربّانی یہ ہے کہ جاؤ، اتمو، ایک دوسرے کے خصم ہو کر یعنی مخاصمت فرماتے ہوئے، لڑتے اور جھگڑتے ہوئے ——— گویا اللہ تعالےٰ جو آدم و حوّا دونوں کا خالق ہے (اور خالق ہی مخلوق کے بارے میں اکمل اطلّاع رکھتا ہے) خاوندوں اور بیویوں کو دنیا میں بھیجتے وقت کا حکم اسی وضاحت کے ساتھ صادر فرمایا تھا لہذا دونوں فریق خشمگیں بھی ہیں اور خصمگیں بھی۔

اب نظم " بیویاں " میں سے کچھ شعر ملاحظہ ہوں۔

سسرال سے جو میکے میں آتی ہیں بیویاں سو سو طرح سے دھوم مچاتی ہیں بیویاں!

کھانے مزے مزے کے کھلاتی ہیں بیویاں جینے کا جو مزا ہے چکھاتی ہیں بیویاں!

کچھ دن تو خوب عیش کراتی ہیں بیویاں
پھر اس کے بعد خون رلاتی ہیں بیویاں!

کچھ لوگ تونہال ہیں بیگم کے ہاتھ سے پاتے ہر ایک مال ہیں بیگم کے ہاتھ سے

کچھ مست جذب وحال ہیں بیگم کے ہاتھ سے آخر میں سب حلال ہیں بیگم کے ہاتھ سے

بچّوں کے چوکے چھکے اڑاتی ہیں بیویاں!
کچھ [illegible] کے چھکے چھڑاتی ہیں بیویاں

یہ لائیے وہ لائیے اور وہ منگائیے !   اس وقت آپ جائیے اس وقت آئیے !

وہ شے جو کھائی آپنے وہ شے نہ کھائیے   ملئے نہ ان سے آپ نہ ان کو بلائیے

مردوں پہ اپنا حکم چلاتی ہیں بیویاں !

افسر تو بنتی ہیں غلام بناتی ہیں بیویاں !

شوہر نامہ بنیادی چیز ہے اس میں یہ مصرع ترجیع ہے ع ہائے کیا چیز بنائی ہے خدا نے شوہر حضرت مرحوم نے حرم رائی اقتدار اعلیٰ کے ترجمان کی حیثیت سے "ہم چشموں" کو جس طرح رسوا کیا ہے اس کا ایک شعر ملاحظہ فرمائیے :

آپ ہو تا ہے اکثر جسے دیکھ کے شرما کے قمر   تیرہ قلب اتنا کہ کالک سیاہی کو بھی ڈر

سوز دل وہ کہ جو بڑھ کے جلا دے گھر   سرد مہر ایسا کہ خود برف کا ٹھٹھرے جگر !

ایسا مجموعۂ اضداد نہیں کوئی بشر !

ہائے کیا چیز بنائی ہے خدا نے شوہر

کورٹ شپ ہو تو محب بنتے مرغوب ہے   بعد ازاں کہتا ہے بیوی کے محبوب ہے

ہر شخص خمر سے ... داد بہت خوب ہے   شفقت مادری مجھ پر ہی ہے مطلوب ہے

ایک ... بالفاظ دگر

ہائے کیا چیز بنائی ہے خدا نے شوہر !

گھر کا بجٹ بھی دلچسپ نظم ہے جس میں گھر کے بجٹ کے پردے میں قومی بجٹ پر ہلکا طنز صاف صاف کیا گیا ہے اس لیے کہ دونوں بجٹ ... کے سہارے چلتے ہیں بعنوان نظم کے ذیل میں ایک نوٹ ہے " تین ارب کی آمد میں سے ایک ارب سود ادا کرنے والے ملک کا بجٹ دیکھ کر " بجٹ کی آمد اور خرچ کی مد بڑی چابکدستی سے واضح کی گئی ہیں متوقع آمد کے جو شعبے تجویز کئے ہیں وہ بڑے فطری اور ہمارے معاشرے کے حوالے سے " روزمرہ " کی باتیں ہیں۔ آپ اسے طنز کہئے ، مزاح سمجھئے ، فن قرار دیجئے ، یا ذاتی حظ تصور فرمائیے یہ آپ کے موضوعی یا معروضی ردعمل پر منحصر ہے ۔

ہے بجٹ میں آئے دن کی دعوتوں کا انتظام   "پلنگوں" کا بھی ہے مد نظر خواہ اس میں ہتمام

ساتھ ہی تحفے تحائف کا بھی ہے کچھ التزام   الغرض نوشتہ ہے کام سو میرا تمام

لیکن اگر آپ درج سے میری سہولت کیلئے !

ہیں یہ سب باتیں ضروری تیری عزت کیلئے

بعد اس کے دیکھئے آمد کے ذرائع کا شمار   تین سو تنخواہ تھی اس پہ رشوت دو ہزار

میں یہ کہتا ہوں کہ رشوت کا نہیں کچھ اعتبار   ہے بنا کرسی پہ اس کی جڑ سے خود آیا ادھار

وہ یہ کہتی ہیں کہ ہرگز یوں نہ کہنا چاہیئے
ہر جگہ ملتی ہے رشوت لینے والا چاہیئے!

کچھ سنہ اووٹالم اس میں پانچ سو لکھتا ہوا | میں یہ کہتا ہوں خدارا سوچئے یہ بھی ذرا
رات دن کی محنتوں سے نیم مردہ میں ہوا | آپ کا کیا حشر ہوگا میں جو "بالکل" مر گیا!

وہ یہ کہتی ہیں کہ مرنے کا نہ کچھ نا ہیں غم
آپ کے پیچھے کی قسطیں مستقل بھرتے ہیں ہم

مندرجہ بالا اشعار میں حضرت مسٹر نے شوہروں کی رشوت خواری اور فتنہ پردازی کی ذمہ داری ساری کی ساری مہتمم دامنِ خانہ داری پر ڈال دی ہے۔ آخر بات سے ڈرتے ہوئے عرض گزار ہوں کہ بات بڑی حد تک تو ٹھیک ہے مگر بیوی کی فرمائشیں اور "ضروریات زندگی" کے علاوہ بھی کچھ تقاضے ہیں جو فقط خاوند کو معلوم ہوتے ہیں اور بیوی کو تو کیا ان کے کراما کاتبین تک کو کانوں کان خبر نہیں ہوتی۔ ایک "شوہر نامہ" بطور رشوت کہہ کر حضرت مسٹر نے گویا LIBERTY لے لی ہے۔

میرا خیال ہے دانہ از خروارے نہیں بلکہ سچ مچ مشتے از خروارے کے بمصداق میں نے مسٹر صاحب کا تعارف کرا دیا ہے۔ اس کتاب میں بدا لوں کا قصیدہ دو گوں اسے کہتے۔ بوڑھے ڈنر اور کمیٹی وغیرہ نظمیں بھی ناشعہ کی نذر ہیں ہیں ______ ہاں وہ فرقہ علیہ جس کا اجتماعی تخلص "چمچہ" ہے بڑا ہی قابلِ رحم فرقہ ہے، وہ لیڈروں یا ہونے والے لیڈروں کے ساتھ بغرض خاطر بھی تعاون کرے تو اس پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا، اس کی جائز تعریف کو بھی حق منفعت کی طرح اور خراج کے بطور قبول کیا جاتا ہے۔ اکثر و بیشتر پارٹیوں کا ساتھ دینا اہل ہمت کا کام ہے مگر بدقسمتی سے انہی پارٹیوں اور ان کے سربراہوں کے نامقبول ہو جانے کے باعث وہ افراد جو اولاً غازی کہلائے بعد میں چمچے قرار دیئے جانے لگتے ہیں اور محض اس لئے کہ وہ اپنے موقف پر قائم رہے ______ مگر آپ گھبرائیں نہیں حضرت مسٹر کے پیش نظر وہ نہیں جو اخلاص کی لنگی کے باعث اس خطاب سے نوازے جاتے ہیں ان کے پیش نظر وہ بہادر پیشہ ور باد فروش چمن اور وصف سرایانِ مرد ہیں جنہیں اللہ نے محض زمانہ ساز بنایا ہے اور ہر طرح اپنا کام نکالنے کا فن سکھایا ہے ______ خواہ ساری دنیا کے تیور ٹیڑھے ہو کر رہ جائیں مگر چمچے اپنا الو ہر حال سیدھا کر لیتے ہیں ______ ایک دو بند درج کئے جاتے ہیں۔ اکبر کے مزاج کی طرح یہاں بھی مزاح کے پیچھے کرب ناک سنجیدگی نظر آتی ہے

جب جا کر دو چمچوں کا کیا بھرتے تو دیکھ | میں ذات کا برتن ہے اسی ذات کا چمچا
انسان کو مشکل سے نظر چمچے کا چہرہ! | رسوا وہ ہوا جس نے نہ اس کھیل کو پایا

کرتا ہے عیاں آپ کا ظرف آپ کا چمچہ
جس ناپ کا برتن ہے اسی ناپ کا چمچہ

ہو جائے جو دنیا میں کہیں "چمچہ شماری" — سب قوموں پہ بھاری پڑے اک قوم ہماری
صدیوں کی غلامی کا نتیجہ ہے یہ خواری ! — "مطلب" پہ جو خودداری ہر اک شخص نے واری

چمچہ گری دراصل غلامی کی ہے عادت !
دو نسل بھی رہ جائے تو بن جاتی ہے خصلت ۔

چلتے چلتے ایک غزل بھی دیکھ لیجیے جسکا عنوان ہے "ڈلتے ڈلتے" حضرت مسٹر عربی المزاج آدمی معلوم ہیں ۔ عربوں کی عادت ہے اور عہد قدیم سے ہے کہ وہ غزل کا عنوان محض "غزل" نہیں لکھتے، نظم کی طرح ہر غزل کا عنوان جدا ہوتا ہے، اس غزل کو پڑھتے وقت آج سے کوئی بیس برس قبل کی ذوالفقار بخاری صاحب کی غزل یاد آجاتی ہے جسکا مطلع تھا : اور کیا خوب تھا ۔

ے چھاؤں کی صورت ڈھلتے ڈھلتے — رہ جاؤں گا چلتے چلتے !!

مسٹر جناب کی غزل بے مطلع ہے ۔ اہل نظر کی دلچسپی کی خاطر ساری غزل نقل کی جا رہی ہے

ے بت وہ کہاں ہو رام ابھی سے — دال گلے گی گلتے گلتے !!
شمع کی صورت اپنی بھی گزری — ہو گیا "ترڑکا"[۱] جلتے جلتے
آتش الفت سرد ہوئی ہے — وصل کا پنکھا جھلتے جھلتے
عشق سے عقد اور عقد سے بچّے — بن گیا طوطا پلتے پلتے !
کر گیا روشن نام ہمارا — مہرِ جوانی ڈھلتے ڈھلتے !
مونگ اور چھاتی جوں کے توں ہیں — گھس گیا بٹّا دلتے دلتے

سہل تھی مسٹر یہ تک بندی
شعر ڈھلے ہیں چلتے چلتے

ماڈرن بنجارہ نامہ کے باب میں ایک گستاخی یہ کرنا ہے کہ اگر نظیر کے بنجارہ نامہ کے اشعار عطر فتنہ میں نہ دیئے جاتے تو اچھا ہوتا " ماڈرن بنجارہ نامہ اُس صورت میں زیادہ معتبر دکھائی دیتا ۔ ویسے حق یہ ہے کہ جس طرح دَور بدلہ ہے اسی طرح مضامین کا بھی طور بدلا ہے ، نظیرؔ اس دَور میں ہوتے تو انہی مضامین پر زورِ طبع صرف کرتے ۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ مزاجی وارفتگی جو نظیرؔ کے یہاں تھی وہ مسٹر کے یہاں ممکن نہیں ۔ اکبرؔ نے فرمایا تھا ۔ باقی صفحہ ۴۱ پر

[۱] ذرا پنجابی کا "ترڑکا" بھی ذہن میں رہے ۔

تندِ تلخ یا تلخابۂ شیریں

"روٹیاں"

[نظیر اکبرآبادی کے تنور میں کچھ روٹیاں ہم نے بھی لگائی ہیں لیکن ہماری روٹیوں کی وضع اور ذائقہ نظیر کی روٹیوں سے مختلف ہے۔ جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اگر نظریاتی ہم آہنگی نہ ہو تو ایک ہی تصویر سے متضاد تاثر لیے جا سکتے ہیں، اور سارا الزام "روٹی" کے بدلے "روٹی کھانے والے اور کھلانے والے" پر بھی آسکتا ہے۔ ———— مسٹر]

نظیر اکبرآبادی

جب آدمی کے پیٹ میں آتی ہیں روٹیاں　　پھولی نہیں بدن میں سماتی ہیں روٹیاں
آنکھیں پری رخوں سے لڑاتی ہیں روٹیاں　　سینے اُپر بھی ہاتھ چلاتی ہیں روٹیاں!
جتنے مزے ہیں سب یہ دکھاتی ہیں روٹیاں

جس جا پہ ہانڈی۔ چولہا۔ توا اور تنور ہے　　خالق کی قدرتوں کا اُسی جا ظہور ہے!
چولہے کے آگے آنچ جو جلتی حضور ہے　　جتنے ہیں نور سب میں یہی خاص نور ہے
اس نور کے سبب نظر آتی ہیں روٹیاں

پوچھا کسی نے یہ کسی کامل فقیر سے　　یہ مہر و ماہ حق نے بنائے ہیں کاہے کے
وہ سُن کے بولا بابا خدا تجھ کو خیر دے　　ہم تو نہ چاند سمجھیں نہ سورج ہیں جانتے
بابا ہمیں تو یہ نظر آتی ہیں روٹیاں

پھر پوچھا اُس نے کہیئے یہ ہے دل کا نور کیا　　اس کے مشاہدے میں ہے کھلتا ظہور کیا
وہ بولا سن کے تیرا گیا ہے شعور کیا　　کشف القلوب اور یہ کشف القبور کیا
جتنے ہیں کشف سب یہ دکھاتی ہیں روٹیاں

روٹی سے جس کا ناک تلک پیٹ ہے بھرا — کرتا پھرے ہے کیا وہ اچھل کود جا بجا
دیوار پھاند کر کوئی کوٹھا اچھل گیا — ٹھٹھا ہنسی شراب صنم ساقی اس سوا

سو سو طرح سے دھوم مچاتی ہیں روٹیاں

روٹی سے ناچے پیادہ قواعد دکھا دکھا — اسوار ناچے گھوڑے کو کاوا لگا لگا
گھنگھرو کو باندھے پیک بھی پھرتا ہے جا بجا — اور اس سوا جو غور سے دیکھا تو ہر جگہ

سو سو طرح کے ناچ دکھاتی ہیں روٹیاں

دنیا میں اب بدی نہ کہیں اور نکوئی ہے — نا دشمنی و دوستی نا تند خوئی ہے
کوئی کسی کا اور کسی کا نہ کوئی ہے — سب کوئی ہے اسی کا کہ جس ہاتھ ڈوئی ہے

نوکر نفر غلام بناتی ہیں روٹیاں

روٹی زپیٹ ہی کو تو کچھ بھی جتن نہ ہو — میلے کی سیر خواہش باغ و چمن نہ ہو
بھوکے غریب دل کی خدا سے لگن نہ ہو — سچ ہے کہا کسی نے کہ بھوکے بھجن نہ ہو

اللہ کی بھی یاد دلاتی ہیں روٹیاں

مبشر دہلوی

روٹی ہے ایک روپ ہیں اس کے مگر کئی — گندم کی ہے کہیں تو کہیں ہے وہ بیسنی
سادی ہے وہ کبھی تو کبھی ہے وہ روغنی — اور شیرمال بن کے نمایاں کہیں ہوئی

روز اک نیا سوانگ رچاتی ہیں روٹیاں
یوں آدمی کے دل کو لبھاتی ہیں روٹیاں

روٹی ہو کوئی اسکا ہے مقدور شکم پری — جزو بدن بھی وہ ہو یہی بات ہے بڑی
کھانے کو کھا ہی لیتے ہیں روٹی یہاں سبھی — کم ہیں کہ جن کو ہضم ہو دیکھا گیا یہی!

روٹی ہو ڈاکٹر کو کھلاتی ہیں روٹیاں
بیوپار گورکن کا چلاتی ہیں روٹیاں

بیچے ہے کوئی جسم تو بیچے ہے کوئی جان — یہ بیچ دے قلم کو تو وہ بیچ دے زبان
بکتا ہے [illegible] — [illegible] روٹی ہے اک دکان

آئینہ آدمی کو دکھاتی ہیں روٹیاں!
کیا کیا وہ بیچتا ہے بتاتی ہیں روٹیاں

بارش کہیں جو ہو تو سبھی جھیلتے ہیں سب   پاتے مگر اسی سے ہیں نشو و نما یہ پھول
اک بچے میں یاد رہے بس یہ اک اصول   جیسا بوئیں گے ویسا ہی ہوگا ثمر وصول

دہقان کو یہ کمال دکھاتی ہیں روٹیاں
فطری صفات سطح پہ لاتی ہیں روٹیاں

ہم دیکھتے ہیں جو بھی ثمر دار ہے شجر   جھکتا ہے شاخ اس کی وہ لاتا ہے جب ثمر
جو لوگ ہیں بھلے بھی ان میں بھی ہے اثر   بھر جائے پیٹ ان کا تو ہوں وہ "شریف تر"

جھکتے ہیں جب شریف کے آتی ہیں روٹیاں
انسانیت کا جلوہ دکھاتی ہیں روٹیاں

بد ہیں جو بھرکے پیٹ ہو ہوا سیر اگر کبھی   بھٹکے کرے خراب کرے فرش کو وہیں
کم ظرف کا بھی حال کچھ اس سے جدا نہیں   روٹی اِدھر ملی تو اُدھر روٹیاں ملیں!

جب پیٹ میں وہ ٹل کے جاتی ہیں روٹیاں
بن کر عذاب سر پہ آتی ہیں روٹیاں

مزدور کے جو پیٹ میں روٹی کہیں پڑی   بیزار اس کی طبع وہیں کام سے ہوئی
برعکس اُن کے بیٹھے ہیں فارغ بھی [illegible]   روٹی اگر ملی تو ہوس اس کی بڑھ گئی

ان کو سکون قلب دلاتی ہیں روٹیاں
صبر و قرار اس کا مٹاتی ہیں روٹیاں

مقبولیت کسی کو جو ملتی نہیں کہیں   احباب اس کے کام سے [illegible] ہیں
سن لو عروج کے نہیں پہنچا کوئی قریں   جب تک کہ اس نے دعوتیں دو چار کر نہ دیں

ہو کر شکم سے قلب کو جاتی ہیں روٹیاں
شہرت کو چار چاند لگاتی ہیں روٹیاں

لیڈر ہے کوئی رنگ سیاست کا گر جمے   محفل میں کھاتے رہے پیتے وہ خوب اڑائے
مزدور اور کسان کے غم میں وہ غم زدہ   دو ڈنر کھلا کے قوم کو اپنی طرف بلائے

یوں سب کو [illegible] لاتی ہیں روٹیاں
[illegible] ہیں روٹیاں

دیکھو تو [illegible] کبھی کبھی جا کے تم ذرا   [illegible] عزت کا [illegible]

قصہ ہر اک کے منہ سے سنو گے یہ ایک سا
چارے کی سمت لپکے تھے بس آ گئی قضا
چوہے کو چوہے دان میں لاتی ہیں روٹیاں
پھر گربۂ اجل سے ملاتی ہیں روٹیاں

روٹی کے جب فریب میں انسان کوئی آئے
آزاد قول و فعل میں اپنے وہ رہ نہ پائے
منہ اس کا روٹی کھائے تو آنکھ اس کی سہلائے
دانا کے ہر اشارۂ ابرو پہ دم ہلائے
آزاد کو غلام بناتی ہیں روٹیاں
نگنی کا اس کو ناچ نچاتی ہیں روٹیاں

روٹی پہ نظم کہہ گئے ایسی میاں نظیرؔ
دنیا کی ہر زباں میں ہے مشکل جو بے نظیر
ویسی ہی نظم کہہ لے کوئی ہے یہ ٹیڑھی کھیر
ہم کیا کریں کہ ہم کو ملیں روٹیاں کثیر
ممکن محال تک کو بناتی ہیں روٹیاں
شاہیں سے پدّیوں کو لڑاتی ہیں روٹیاں

دعوت و تبلیغ دین کے موضوع پر

مولانا امین احسن اصلاحی

کی شاہکار تصنیف

دعوتِ دین اور اس کا طریق کار

فہرست ابواب: مروجہ طریق تبلیغ کی غلطیاں، تبلیغ کس لیے؟، انبیاء کرام پہلے کن کو مخاطب کرتے ہیں؟، انبیاء کا طریق خطاب، دعوت دین کی تدریج، دعوت حق کے طریقے، دعوت کی زبان اور داعیانہ طرز کلام، انبیاء کرام کا طرز استدلال، مخاطب کی نفسیات کا لحاظ، انبیاء کرام کا طریق تربیت، داعیِ حق کی ذمہ داری، دعوت حق کے مخالفین، دعوتِ حق کے موافقین، دعوتِ حق کے مراحل

سائز ۱۸×۲۲/۸ ! صفحات ۲۳۲، کاغذ نیوز پرنٹ، طباعت آفسٹ۔ مجلد مع ڈسٹ کور، قیمت: -/۵ روپے

دار الاشاعت الاسلامیہ، کوثر روڈ، اسلام پورہ۔ لاہور ۲

پروفیسر یوسف سلیم چشتی

تعارفِ کُتب

۱۔ میزانِ اقبال

مصنفہ پروفیسر محمد منوّر آف گورنمنٹ کالج لاہور
صفحات ۱۷۶، سائز ۲۰×۳۰/۱۶۔ کاغذ سفید۔ طباعت آفسٹ
ناشر:۔ یونیورسٹی بک ایجنسی ۱۹۴ انارکلی۔ لاہور۔ قیمت آٹھ روپے

مدتوں کے بعد اقبال پر ایسی کتاب پڑھنے کا اتفاق ہوا ہے جس کو پڑھ کر معلومات میں اضافہ ہوا۔ مصنّف کے استاد نے بھی مقدمے میں مجھ سے اتفاق کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ "ان مضامین کے مطالعے سے اقبالیات کے سلسلے میں میری معلومات میں اضافہ ہوا ہے۔" ص۶

مقدمہ نگار موصوف نے ہر مضمون کی خصوصیات واضح کر دی ہیں اور اس جامعیت کے ساتھ کہ اب ان پر کوئی اضافہ ممکن نہیں ہے۔ یوں بھی میرا مطالعۂ اقبال بالکل سطحی ہے۔ واللہ جانے پروفیسر صاحب نے مجھ کم سواد کو اپنے مقالات پر تبصرہ کرنے کے لیے کیوں منتخب فرمالیا؟

میزانِ اقبال میں سات مقالات ہیں۔ پہلے مقالے کا عنوان ہے "کلامِ اقبال پر عربی ادب کے اثرات" میں اس مجلس میں موجود تھا جس میں انھوں نے یہ مقالہ پڑھا تھا اور مجھے یاد ہے حاضرینِ مجلس نے اسے بہت پسند کیا تھا۔ دوسرا مضمون، عجم کے مفہوم پر لکھا ہے جس سے ہماری معلومات میں اضافہ ہی نہیں ہوتا بلکہ ہمیں یہ بھی معلوم ہو سکتا ہے کہ اقبال ہمیں "عجمیت" سے کیوں مجتنب رہنے کی تلقین کرتے تھے۔

تیسرا مضمون "توازن" ـــ اقبال کی شاعری کا فی الحقیقت اہم پہلو ہے۔ مرزا صاحب نے ثابت کیا ہے کہ "ان کا نظامِ فکر اقبال کے علاوہ کسی دوسرے سے منسوب نہیں کیا جا سکتا۔" یعنی ان کے کلام میں ایسے افکار نہیں پائے جاتے جو ان کے نظامِ فکر سے مطابقت نہیں رکھتے۔ یہ مضمون بلاشبہ اپنی جدّت اور ندرت کے لحاظ سے بہت وقیع ہے۔

اقبال کی اردو غزل اور اقبال کی نظم میں مرزا صاحب نے اقبال کے شاعرانہ محاسن کی وضاحت کی ہے اور اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ فلسفیانہ افکار کی کثرت کے باوجود اقبال کی شاعری

میں لطافت بیان اور شیرینیٔ آہنگ کے جلوے عام ہیں۔ یہ مضمون بڑا ہی دلچسپ ہے اور جب میں نے اس مضمون میں حکیم مومن خاں صاحب مومنؔ دہلوی کا یہ شعر پڑھا کہ ؎

گر پھر بھی اشک آئیں تو سمجھیں کہ عشق ہے
حقے کا تو رقیب کی جانب دھواں نہ چھوڑ

تو بلاشبہ مجھے بھی حیرت ہوئی کہ مومنؔ اور یہ شعر!

جوشؔ ملیح آبادی پر مرزا صاحب کی تنقید پڑھ کر جی خوش ہو گیا بلکہ دعا نکلی کہ "اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ"۔ فی الجملہ ان مقالات سے اقبال فہمی میں بہت سہولت ہو گئی ہے۔

اللہ مرزا صاحب کو توفیق عطا فرمائے کہ وہ اقبال کے مشہور عالم خطبات کی شرح لکھ سکیں۔ اقبال نے ۱۹۳۱ء میں مجھ سے کہا تھا۔ یہ کتاب المامون کے عہد میں لکھی جاتی تو ساری دنیائے علم میں ایک ہنگامہ برپا ہو جاتا۔

اب ۱۹۷۲ء ہے لیکن ابھی تک پاکستان میں بھی اس کتاب کا چرچا سننے میں نہیں آیا۔ اور سننے میں بھی کیسے آئے؟

قوم کو بقولِ فیضؔ، عوامی رقص کی محفلیں برپا کر کے اپنی ثقافت کو محفوظ کرنے کے فرض سے ہی فرصت نہیں ہے۔ تا بہ اقبال چہ رسد و چرا رسد و چگونہ رسد؟

آخر میں ناشر سے ایک دوستانہ شکایت ہے اور وہ یہ کہ اس نے اس مختصر اور غیر مجلد کتاب کی قیمت بہت زیادہ رکھ دی ہے۔ ہماری رائے میں اس پر نظرِ ثانی لازم ہے تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ کتاب سے استفادہ کر سکیں۔ (ی۔ س۔ چ)

---

۲۰ بیس بڑے مسلمان مرتبہ: مولوی عبدالرشید صاحب ارشد

سائز ۲۰×۳۰/۸ صفحات ۱۰۲۰۔ کاغذ سفید۔ طباعت آفسٹ۔ قیمت تیس روپے۔ ملنے کا پتہ: مکتبہ رشیدیہ۔ ۱۰۳۲ اے شاہ عالم مارکیٹ۔ لاہور۔

اس قابلِ مطالعہ کتاب میں ارشد صاحب نے حسبِ ذیل اکابر کے حالات جمع کیے ہیں۔ حضرات حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکیؒ۔ مولانا محمد قاسم نانوتویؒ۔ مولانا رشید احمد گنگوہیؒ۔ مولانا اشرف علیؒ تھانوی۔ شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ۔ علامہ محمد انور شاہ محدث کشمیریؒ۔ مولانا عبید اللہ سندھیؒ۔ مفتی کفایت اللہ دہلویؒ۔ شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد صاحب مدنیؒ۔ علامہ

شبیر احمد عثمانیؒ - مولانا محمد الیاس دہلویؒ - مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ - مولانا احمد علی لاہوریؒ - مفتی محمد حسن امرت سریؒ - مولانا ابوالکلام آزادؒ - مولانا محمد علی جوہرؒ - مولانا سید سلیمان ندویؒ - مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ - مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمان سیوہاریؒ - اور سردار احمد خاں پتافیؒ -

فاضل مرتب نے اس کتاب کے تعارف کے سلسلے میں لکھا ہے کہ جن اصحاب کا ہم نے اس کتاب میں تذکرہ کیا ہے، انھوں نے امت مسلمہ کے لیے جو کارہائے نمایاں انجام دیے، ان پر وہ کسی سے صلہ وستائش یا داد و تحسین کے طالب نہیں تھے۔

ان کی نظر "ان اجری الا علی اللہ" پر تھی - انھوں نے رضائے الٰہی کے بلند نصب العین کی خاطر خدا کے بندوں کو اس کے دین کی دعوت پہنچائی - اور اس کے لیے ہر قسم کے مصائب بخوشی برداشت کیے - یہ حضرات ملک بدر ہوئے، قید و بند سے دوچار ہوئے - شعلوں میں کودے، آگ سے کھیلے طوفانوں سے ٹکرائے، سلطنت برطانیہ کا مقابلہ کیا اور جیلوں میں ہر قسم کے مصائب جھیلے - مگر اس کے عوض ہمیں صحیح دین، خالص توحید، عشق رسولؐ، اتباع سنت اور احترام اسلاف، علم و عمل کے بے پناہ جذبے اور آزادی کی نعمت سے مالا مال کر گئے - ان کی بلندیٔ کردار، حسنِ عمل اور پاکیٔ سیرت کو تاریخ کے صفحات میں محفوظ کرنا اور ان کے افکار و کردار سے ملت کو آشنا کرنا وقت کا اہم تقاضا تھا - ہم نے یہ سعادت حاصل کرنے کی جہد وسعی کی ہے - اس میں ہم کس حد تک کامیاب ہوئے ہیں، اس کا فیصلہ ہم خود نہیں کرتے، قارئین پر چھوڑتے ہیں۔"

میں نے اس کتاب کو پوری توجہ سے پڑھا ہے اور مجھے اس اعتراف میں کوئی تامل نہیں ہے کہ فاضل مرتب اپنی سعی میں سراسر کامیاب ہوئے ہیں - انھوں نے یہ کتاب گذشتہ سال تبصرے کے لیے دی تھی - میرا خیال یہ تھا کہ مفصل تبصرہ لکھوں گا لیکن اپنے ذاتی طالب علمانہ انہماک کی وجہ سے اس کام کی فرصت نہ مل سکی اور نہ مستقبل میں اس کی امید ہے - اس لیے ان چند تعارفی سطور پر اکتفا کرتا ہوں اور برادرم ارشد صاحب سے معذرت خواہ ہوں (ی - س - ح)

سیرت شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی - ایک شخصیت - ایک مطالعہ

شائع کردہ:- ادارۂ تصنیف و تالیف - سائز ۲۰×۳۰/۱۶ ۳۰۰ صفحات، کاغذ سفید - کتابت اور طباعت گوارا - قیمت: چار روپے پچاس پیسے - ملنے کا پتہ: مکتبہ مظفر، ناشر قرآنی قطعات، محلہ فیض آباد، سرگودھا روڈ، گجرات

حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کی وفات کے بعد "الجمعیۃ" دہلی اور "خدام الدین" لاہور نے ۱۹۵۸ء میں "مدنی نمبر" شائع کیا تھا۔ جن میں حضرت اقدسؒ کے شاگردوں، مریدوں، مداحوں اور ہمعصروں نے آپ کی جامع حیثیات شخصیت کے مختلف گوشوں کو اجاگر کیا تھا۔ یہ دونوں نمبر مدتوں سے نایاب ہو چکے ہیں۔ بمقابل ایں، حضرت اقدسؒ کے عقیدتمندوں کی تعداد میں بفضلِ خدا، بتدریج اضافہ ہو رہا ہے جو قدرتی طور پر اس صدی کے مجاہد اعظم کے روحانی، دینی، علمی، اخلاقی، تدریسی اور سیاسی کارناموں سے واقف ہونا چاہتی ہے۔ میں چونکہ خود بھی حضرت اقدسؒ کے کفش برداروں میں سے ہوں اس لیے گذشتہ سال یہ فیصلہ کیا تھا کہ دہلی اور لاہور کے مدنی نمبروں سے حضرت اقدس کی حیاتِ مبارکہ کا ایک مرقع تیار کروں جس کی روشنی میں حضرت اقدسؒ کی شخصیت کا ہر پہلو نمایاں ہو سکے۔

مقام مسرت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ابوظفر صاحب کو اس کارِ خیر کی توفیق بخشی اور انھوں نے "الجمعیۃ" دہلی اور "خدام الدین" لاہور کے مدنی نمبروں سے وہ اقتباسات کتابی صورت میں جمع کر دیے جن کے مطالعے سے حضرت اقدسؒ کی زندگی کا اجمالی خاکہ سامنے آ جاتا ہے۔

مجھے یقین ہے کہ اس کتاب کے مطالعے سے حضرت اقدسؒ کا علمی اور روحانی مقام قارئین پر بآسانی واضح ہو سکے گا۔ (یوسف سلیم چشتی)

۴۔ مآثر الکرام

مصنفہ حسان الہند علامہ میر غلام علی آزاد بلگرامی متوفی ۱۲۰۰ھ بزبان فارسی سائز ۳۰×۲۰ صفحات ۲۹۶۔ کاغذ سفید۔ طباعت عمدہ۔ قیمت مجلد مع گرد پوش ۱۶ روپے۔ ملنے کا پتہ: مکتبۂ احیاء العلوم الشرقیہ ۳۹۔ شارع علامہ اقبال روڈ۔ لاہور

علامہ آزاد بلگرامی ۱۱۱۴ھ تا ۱۲۰۰ھ (۱۷۰۳ء تا ۱۸۷۶ء) ان علماء میں سے ہیں جن کا نام ہندوستان میں ہمیشہ زندہ رہے گا۔ وہ ایک بلند پایہ عالمِ دین ہی نہ تھے بلکہ زبردست ادیب، شاعر، مؤرخ اور محقق بھی تھے۔ ان کی تصانیف میں مآثر الکرام بہت مشہور ہے۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق صاحب نے اس کتاب پر ۱۹۱۰ء میں نہایت فاضلانہ مقدمہ لکھا تھا جس میں مصنف کے عہد کی تصویر بھی کھینچی ہے اس سلسلے میں ان کا یہ جملہ ان کی ژرف نگاہی پر دال ہے۔ "ایک بات تاریخی حیثیت سے اس تذکرے میں خاص طور پر قابلِ لحاظ ہے۔ وہ یہ کہ ان علماء و فضلائے بلگرام سے جن کا اس کتاب میں ذکر ہے، ایک بھی شیعہ نہیں ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مذہب شیعہ نے وہاں بعد کے

زمانے میں رواج پایا"...... معلوم ہوتا ہے کہ آزاد کے زمانے میں اہل تشیع دیاں نہ تھے اور اگر تھے تو خال خال۔

عبدالحق صاحب کے مقدمے کے بعد ڈاکٹر وحید قریشی نے پیش لفظ لکھا ہے، جس میں کتاب سے متعلق مفید معلومات جمع کر دی گئی ہیں۔ آخر میں عبدالرزاق صاحب قریشی رکن اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بمبئی (بھارت) کی مرتبہ سیرت آزاد شامل کر دی گئی ہے۔

اس کتاب میں آزاد مرحوم نے اپنے زمانے (اٹھارھویں صدی عیسوی) کے اکیاسی علماء و فضلا کا تذکرہ سپرد قلم کیا ہے جو نہایت دلکش اور پر از معلومات ہے۔ یہ کتاب فارسی دان حضرات کے لیے بلاشبہ ایک نادر تحفہ ہے۔ (ی - س - پ - ح)

۵۔ صحیح مسلم شریف کا انگریزی ترجمہ مع تعلیقات مفیدہ

از پروفیسر عبدالحمید صاحب صدیقی ایم اے۔ سائز $\frac{20 \times 30}{8}$ ۔ جزو اول ۷۶ صفحات۔ کاغذ سفید۔ طباعت ٹائپ۔ ملنے کا پتہ: شیخ محمد اشرف تاجر کتب کشمیری بازار۔ لاہور

اسلامی دنیا میں صحیح مسلم شریف کی اہمیت محتاجِ تصریح و تعارف نہیں ہے۔ اس کے انگریزی ترجمے کی ضرورت ایک عرصے سے محسوس کی جا رہی تھی تاکہ انگریزی داں طبقہ حدیث کی اہمیت اور افادیت سے آگاہ ہو سکے۔ بڑی خوشی کا مقام ہے کہ شیخ محمد اشرف صاحب نے اس عظیم الشان کام کا بیڑا اٹھایا اور ایسے شخص کو اس کام کے لیے منتخب کیا جو بفضل خدا اس کام کے لیے بالکل موزوں ہے۔ صدیقی صاحب کی ساری عمر اسلامیات کے مطالعے میں گزری ہے اور انھیں عربی اور انگریزی دونوں زبانوں پر قدرت حاصل ہے۔ اس کا ثبوت ترجمہ کا بغور مطالعہ کرنے سے مل سکتا ہے۔ فاضل مترجم نے شروع میں ایک مقدمہ لکھا ہے جو بہت مفید اور پر از معلومات ہے۔ اس کے پڑھنے سے حدیث کی اہمیت اور ضرورت دونوں باتوں کا احساس ہو جاتا ہے۔ حواشی اور تعلیقات میں انھوں نے ہر مشکل لفظ اور ہر اصطلاح کی شرح کر دی ہے اور ہر راوی کا مختصر تذکرہ بھی سپرد قلم کر دیا ہے۔ بلاشبہ جب یہ کام پایۂ تکمیل کو پہنچ جائے گا تو اہل علم کی نگاہ میں یہ ترجمہ صدیقی صاحب کی علمی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ شمار کیا جائے گا۔ میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ انھیں اس کام کو مکمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (ی - س - پ - ح)

"حیات محمدؐ" بزبان انگریزی

سائز $\frac{22 \times 18}{8}$ - ۳۹۵ صفحات۔
شائع کردہ: اسلامک پبلی کیشنز ۱۳ ای شاہ عالم مارکیٹ لاہور
کاغذ معمولی مجلد ۱۲ روپے ۵۰ پیسے - غیر مجلد ۱۱ روپے ۵۰ پیسے۔

یہ مفید کتاب بھی پروفیسر عبدالحمید صاحب ہی کے قلم کا ثمر شیریں ہے۔ انگریزی دان طبقہ ایک عرصہ سے انگریزی زبان میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سوانح حیات کا مطالعہ کرنے کا آرزومند تھا۔ الحمد للہ کہ صدیقی صاحب نے بڑی محنت اور تحقیق کے ساتھ **حیات محمدؐ** لکھ کر وقت کی اس ضرورت کو پورا کر دیا۔ صدیقی صاحب نے اردو، فارسی، عربی اور انگریزی میں اس موضوع پر جس قدر کتابیں شائع ہوئی ہیں ان میں سے بیشتر کو مدنظر رکھا ہے اور سب سے بڑی خصوصیت اس کتاب کی یہ ہے کہ غیر مسلموں نے آنحضرت کی سیرت پر جس قدر اعتراضات کیے ہیں، ان کا جواب دیا گیا ہے زبان اور بیان کی خوبیوں کے لیے مصنف کا نام کافی ہے۔ دعا ہے کہ انھیں دین کی مزید خدمت کی توفیق ملے۔

(ر۔ ح)

تفہیم الاسلام یعنی حدیث پاک کے متعلق مغالطوں کا ازالہ

مؤلفہ مولانا مسعود احمد صاحب بی۔ ایس سی (کراچی)

شائع کردہ: اہلحدیث اکادمی لاہور۔ سائز $\frac{26 \times 20}{8}$ - کاغذ سفید - ۵۶۶ صفحات - کتابت اور طباعت گوارا - قیمت: - پندرہ روپے۔

محترمی مولانا محمد عطاء اللہ صاحب حنیف نے اس کتاب کے مقدمے میں لکھا ہے کہ "حدیث شریف اور علمائے اسلام کے متعلق انگریزی تعلیم یافتہ اور ان سے وابستہ حضرات کے دلوں میں جو بڑی بڑی غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں، ان کا ایک مرقع ڈاکٹر غلام جیلانی برق کی مشہور کتاب "دو اسلام" ہے جس کا موضوع علماء کی تضحیک اور حدیث کا استخفاف ہے"۔

مولانا مسعود احمد صاحب نے اپنے درس حدیث میں برق کی اس کتاب کے اعتراضات کا تحقیقی جواب دیا جسے مولانا عبدالسلام صاحب بریلوی نے قلمبند کر لیا، اور اہل حدیث اکادمی لاہور نے اسی جواب باصواب کو افادہ عام کی غرض سے شائع کر دیا ہے۔ الحمد للہ کہ مسعود احمد صاحب نے تمام اعتراضات کا تحقیقی اور تسلی بخش جواب دیا ہے۔ اس کا مطالعہ ان لوگوں کے لیے از بس ضروری ہے جن کے خرمن ایمان کو برق نے جلا دیا ہے۔ لیکن کتاب کی قیمت زیادہ ہے۔ میری رائے میں تبلیغی نقطۂ نگاہ سے قیمت میں کمی کرنا لازمی ہے۔

(ر۔ ح)

۸۔ اسباق النحو

از خالد مسعود۔ سائز ۱۸×۲۲ کے ۴۴ صفحات، سفید کاغذ پر آفسٹ کی طباعت۔ پیپر بیک۔ ہدیہ: ۳ روپے ۵۰ پیسے۔

شائع کردہ:۔ حلقہ تدبر قرآن، خالد منزل، رحمان اسٹریٹ، سلم کالونی سمن آباد لاہور۔

اس کتاب پر اپنی جانب سے کسی تبصرے کے بجائے مولانا امین احسن اصلاحی کا رقم کردہ پیش لفظ ہی ہدیۂ ناظرین کیا جاتا ہے۔ وَھُوَ ھٰذَا:۔

"فن نحو میں یہ کتاب میرے ایک دیرینہ خواب کی تعبیر ہے۔ ایک عرصہ دراز سے میری یہ آرزو رہی ہے کہ مولانا فراہی کی اسباق النحو کو بنیاد بنا کر، اردو میں نحو کی ایک ایسی کتاب مرتب کر دی جائے جو عربی کا شوق رکھنے والے نوجوانوں کے لیے آسان بھی ہو اور کفایت کرنے والی بھی۔ الحمدللہ ہمارے فاضل رفیق، برادر عزیز خالد مسعود سلمہ اللہ تعالیٰ نے یہ کام نہایت حسن و خوبی کے ساتھ انجام دے دیا۔ فاضل مؤلف نے محنت کر کے وہ تمام خلا بھر دیے ہیں جو مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب میں معلم کی مشق و تمرین پر اعتماد کر کے چھوڑ دیے تھے اور بعض وہ بحثیں بھی مکمل کر دی ہیں جو اصل کتاب میں ناتمام رہ گئی تھیں۔ اب میرے نزدیک یہ کتاب طلبۂ فن کے لیے کافی ہے۔ اس سے عربی زبان سیکھنے کی راہ باز ہو جائے گی، پھر قرآن و حدیث اور ادب عربی کی اعلیٰ کتابوں کے مطالعہ سے جب اس زبان کا ذوق پیدا ہو جائے گا تو اس فن کے نازک اور مشکل مسائل حل کرنے کے لیے کلید خود ہاتھ آ جائے گی۔

یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ عربی زبان سے ہمارا تعلق محض ایک زبان کی حیثیت سے رسمی اور وقتی نہیں ہے بلکہ یہ واجبات دین میں سے ہے۔ ہمارے دین کے اصل ماخذ۔ قرآن و حدیث۔ عربی میں ہیں اس وجہ سے اس زبان کا سیکھنا سکھانا ہمارے لیے ضروریات دین میں داخل ہے۔ اگر اس زبان سے ہمارا تعلق منقطع ہو جائے تو خود دین سے بھی ہمارا تعلق براہ راست باقی نہیں رہ سکے گا بلکہ یہ صرف بالواسطہ رہ جائے گا جس کا نتیجہ بالآخر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جس طرح یہود و نصاریٰ اپنے صحیفوں کی اصل زبان سے محروم ہو جانے کے سبب سے اپنے دین ہی سے محروم ہو بیٹھے اور تورات و انجیل کی تعلیمات بالکل محرف ہو کر رہ گئیں اسی طرح خدانخواستہ ہم بھی قرآن کو محرفین کی ایک بازیگاہ بنا دیں گے۔ امت کو اس فتنہ سے محفوظ رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ ہمارے اندر ایک گروہ ایسے لوگوں کا برابر پیدا ہوتا رہے جن کو دین میں اجتہاد و تفقہ کا مرتبہ حاصل ہو اور یہ چیز ظاہر ہے کہ بغیر اس کے ممکن نہیں کہ اس گروہ کو قرآن و حدیث کی اصل زبان میں پوری مہارت حاصل ہو۔

اس مقصد کو پیش نظر رکھ کر عربی زبان کی تعلیم کو آسان بنانے کے لیے یہ کتاب مرتب کی گئی ہے۔ یہ اس راہ میں پہلا قدم ہے۔ آگے انشاء اللہ اسی نہج پر دین کی پوری تعلیم کا نصاب تیار کر دیا جائے گا۔ اس طرح ان نوجوانوں کے لیے عربی سیکھنے کی راہ ہموار ہو جائے گی جو عربی مدرسوں کے پیچیدہ طریقوں اور ان کی مغلق کتابوں سے گھبراتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ مؤلف کی اس سعی کو مشکور فرمائے۔ ان کو اپنے دین کی خدمت کی بیش از بیش توفیق بخشے اور اس کتاب سے ہماری نسل کے اندر عربی سیکھنے کی ہمت اور اس کا شوق پیدا ہو۔　　دعاگو

امین احسن اصلاحی، ۳۰ ستمبر ۱۹۷۲ء

احساسات وتاثرات

ایک خط

گرامی قدر ڈاکٹر صاحب!

سلام مسنون۔ میں نے یونیورسٹی سطح تک تعلیم حاصل کی ہے اور بفضل خدا راسخ العقیدہ مسلمان ہوں لیکن فطری طور پر مذہبی رجحانِ طبع نہیں رکھتا اور مجھے مذہبی قسم کے لٹریچر سے بھی زیادہ دلچسپی نہیں ؎

جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد پر طبیعت ادھر نہیں آتی

ایک دوست کے اصرار پر آپ کی تالیف "مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق" کا مطالعہ کیا۔ آپ نے جس سائنٹیفک طریق اور منطقی استدلال سے عام فہم زبان میں قرآن حکیم کی جانب رغبت و شوق دلانے کی سعی جمیل کی ہے اس دلنشین اور موثر اندازِ تحریر پر آپ کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ اگر علمائے کرام ثقیل الفاظ، بھاری بھرکم اصطلاحات، غیر مانوس زبان و بیان، تنفرطیت، تنگ نظری اور مولویانہ طنز یہ طرزِ تخاطب سے اجتناب کر کے استدلالی اندازِ تقریر و تحریر اور سادہ اسلوب بیان اختیار کرتے ہوئے خلوص اور خیر خواہی کے ساتھ دعوتِ تعقل و تفکر دیں تو تعلیم یافتہ نئی نسل ضرور اس بات کو ذہنی طور پر تسلیم کرے گی "امت مسلمہ کے تمام تر زوال و ادبار کا واحد علاج یہی ہے کہ اس کا تعلق اللہ کے دین کے ساتھ صحیح ہو جائے" اور اس صورت میں ضرور مثبت اور مسعود نتائج برآمد ہوں گے۔

ضخیم کتابوں کی بجائے اگر مخصوص اہم موضوعات کو تحقیقی مقالات کے طور پر کتابچوں کی صورت میں شائع کیا جائے تو تعلیم یافتہ ماڈرن طبقہ کو مذہبی لٹریچر کی جانب راغب کیا جا سکتا ہے۔ تحریر میں اگر سادگی، صداقت، خلوص اور بے ساختگی ہو تو دل پر ضرور اثر کرتی ہے۔ مثلاً میں اس پیراگراف سے بے حد متاثر ہوا۔ صفحہ ۴۲

"اور میں نہیں سمجھتا کہ ایک ایسا مسلمان جس نے کچھ بھی پڑھا لکھا ہو گا یہ کہ غیر ملکی زبان تک سیکھی ہو۔ بی اے، ایم اے پاس کیا ہو ڈاکٹری اور انجینئرنگ جیسے مشکل علوم و فنون حاصل کیے ہوں۔ وہ اللہ تعالیٰ کی عدالت میں اتنی عربی بھی نہ سیکھ سکنے پر کیا عذر پیش کر سکے گا جس سے وہ اس کے کلام پاک کا فہم حاصل کر سکتا"

ڈاکٹر صاحب! میں سنجیدگی سے آپ سے استفسار کرتا ہوں کہ میرے لیے کوئی بہترین عربی کا ٹیوٹر تجویز کر دیں جس کی مدد سے میں اس عمر میں "اتنی سی عربی" سیکھ لوں۔ اگر آپ نے اسی موقع پر رہنمائی نہ کی۔ تو اس عدالت میں یہی عذر پیش کروں گا کہ ڈاکٹر اسرار احمد نے مجھے کوئی "رہنما کتاب" نہ بتائی جس کی مدد سے میں واجبی سی عربی سیکھ سکتا[1]

(رانا شمشیر خان ایم۔ اے رساکن قلعہ سوبھا سنگھ ضلع سیالکوٹ۔ ۱۵ ؍ نومبر ۱۹۷۲ء)

---

[1] جواباً گزارش ہے کہ بحمد اللہ ایسے مولانا امام حمید الدین فراہیؒ کی تصنیف "اسباق النحو" شائع ہو گئی ہے۔ اس کا تفصیلی ذکر تعارف کتب کے ذیل میں ملاحظہ فرمائیں۔ (اسرار احمد)

ڈاکٹر اسرار احمد کی مقبول عام تصنیف

مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق

جو کچھ عرصہ سے نایاب تھی ، اب

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

کے زیر اہتمام مفید اضافوں کے ساتھ عمدہ سفید کاغذ پر چھپ گئی ہے۔

خود پڑھیئے

اور دوستوں و عزیزوں کو بطور تحفہ پیش کیجئے۔

سائز ۱۸ × ۲۲ / ۸ ، صفحات ۸۰ ، طباعت آفسٹ ، سفید کاغذ اورخوشنما کور

ہدیہ صرف ایک روپیہ

منگوانے کا پتہ

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

۱۲ - افغانی روڈ - سمن آباد - لاہور (فون : 68245)

Regd. No. L. 7360

Monthly "MEESAAQ" Lahore

Vol. 19 | DECEMBER 1972 | No. 12

جماعتِ اسلامی

- کن مقاصد کے تحت قائم ہوئی تھی ؟
- آزادی سے قبل اس کے نظریات کیا تھے ؟
- قیامِ پاکستان کے بعد اس نے کیا طرزِ عمل اختیار کیا ؟ اور
- اس کے کیا نتائج برآمد ہوئے ؟

جماعت کے ماضی و حال کا ایک تاریخی تجزیہ جماعت کے سابق کارکن کے قلم سے

تحریکِ جماعتِ اسلامی

ایک تحقیقی مطالعہ

تالیف

ڈاکٹر اسرار احمد ایم اے ایم بی بی ایس

سابق ناظمِ اعلیٰ اسلامی جمعیت طلبہ پاکستان و امیر جماعت اسلامی منٹگمری

● ضخامت -- ۳۰۰ صفحات ● سائز بڑا ● طباعت آفسٹ ● مجلد مع گردپوش
● قیمت -- ۴ روپے علاوہ محصول ڈاک

دار الاشاعت الاسلامیہ
کرشن نگر، لاہور

پبلشر : محی الدین ۔ طابع : شیخ محمد اشرف مالک اشرف پریس ایبک روڈ لاہور
مقامِ اشاعت : کوثر روڈ اسلام پورہ (کرشن نگر) لاہور